غالبیات

(کچھ مطالعے اور مشاہدے)

کالی داس گپتا رضاؔ

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ ممبئی

کالی داس گپتا رضاؔ

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ ممبئی

نام کتاب ———— غالبیات۔ کچھ مطالعے اور مشاہدے

بارِ اوّل ———— ۱۹۹۸ء

مولّف ———— کالی داس گپتا رِضا

تعداد ———— ۴۰۰

کتابت ———— حافظ صغیر احمد، اِلٰہ آبادی

پرنٹرز ———— انٹرپرائزز۔ واشی
نیو ممبئی ۔ ۴۰۰۷۰۳

پبلشرز ———— سا کار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
۷۔۱ جولی بھون نمبر ۱
۱۰ نیو مرین لائن۔ ممبئی ۴۰۰۰۲۰

قیمت ———— ۱۰۰ روپے

عرضِ حال

"غالبیات۔ کچھ مطالعے اور مشاہدے" ایک سو گیارہ (۱۱۱) مختصر موضوعات پر محیط ہے۔ یہ وہ تحریریں ہیں جنھیں میں، غالب اور غالبیات پر کام کرتے ہوئے، مختلف اوقات میں نوٹ کرتا رہا۔ اِن پر میں نے اضافہ یہ کیا ہے کہ بعض پر اپنی طرف سے حواشی لکھ دیے ہیں اور بعض کو دوسرے دانشوروں کی آرا سے آراستہ کر دیا ہے۔

یہ مختصر مضامین نہ غالب اور غالبیات پر میرے کام کی نقل ہیں نہ اس کی توسیع۔ ان کی حیثیت جُداگانہ ہے۔

مجھے اُمّید ہے کہ میری یہ کتاب بھی کارآمد ثابت ہوگی۔

کالی داس گپتا رضاؔ
ممبئی۔ ۴۰۰۰۳۶
۲۷ دسمبر ۱۹۹۷ء

فہرست

	صفحہ

(۱)

درفشِ کاویانی۔ مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالبؔ[۱] لاہور ۱۹۶۹ء

ص ۸ پر حاشیے میں پروفیسر محمدؐ باقر تحریر فرماتے ہیں:

"اس (قاطعِ برہان کی حمایت اور مخالفت کے) ہنگامے میں منشی جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی کا کردار عجیب نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو وہ آغا احمد علی احمد کی حمایت میں قطعہ لکھتا ہے، جس سے بظاہر غالبؔ کی مخالفت مقصود تھی اور دوسری طرف وہ قاطعِ بُرہان کی توصیف بھی کرتا ہے۔ قاطعِ بُرہان کی طباعت پر جوہرؔ کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔

دریں کتاب مسمّی بہ قاطعِ بُرہاں
نگر کہ خانۂ غالبؔ چہ مایہ گوہر سُفت
بیا کہ جوہرِ رنگیں صغیر بے کم و بیش
نگار خانۂ فرہنگ سالِ طبعش گفت"

حقیقت یہ ہے کہ جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی اور جواہر سنگھ جوہرؔ خالقِ قطعہ دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی منشی بختاور سنگھ راقمؔ کے بیٹے تھے۔ اُردو میں خواجہ وزیر کے اور فارسی میں گُل محمدؐ خاں ناطق مکرانی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ جواہر سنگھ جوہرؔ خالقِ قطعۂ تاریخ رائے چھج مل دہلوی کے صاحبزادے تھے۔ جہاں جوہرؔ غالبؔ کے شاگردِ رشید تھے وہاں رائے چھج مل غالبؔ کے خاص دوستوں میں تھے۔ جس زمانے میں غالبؔ کلکتہ گئے تھے اپنے معاملات کی دیکھ بھال رائے چھج مل ہی کو سونپ کر گئے تھے۔

---

[۱] "خامۂ غالبؔ" ہونا چاہیے۔

(۲)

مباحثۂ گلزارِ نسیم یعنی معرکۂ چکبست و شرر

مرزا محمد شفیع شیرازی - ۱۹۱۳ء ص ۱۵۸

احمد علی شوق مرحوم (اودھ پنچ ۱۷ر اگست ۱۹۰۵ء) رقم طراز ہیں:

"حضرت غالب مرحوم کا دیوانِ فارسی جب منشی نولکشور مرحوم کے مطبع میں چھپنے کو آیا، تب مولوی محمد ہادی علی اشک مرحوم مصحح تھے۔ انھوں نے حضرت غالب کو تحریر فرمایا کہ آپ سے دھوکا ہو گیا ہے۔ یعنی آپ فرما گئے ہیں ؎

چونانکہ لب زمزمۂ یا ابوالحسن

یہ مصرعہ حضرت غالب مرحوم کے ایک قصیدۂ فارسی کا ہے۔ دراصل حرفِ ندا کے ساتھ "ابا الحسن" فرمانا چاہیے تھا۔ حضرت غالب نے جواب تحریر فرمایا کہ میں نے کہا اسی طرح ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غلط لفظ اپنی غلط حالت کے ساتھ چھپ گیا اور اب بھی اسی طرح دیوان میں موجود ہے۔"

مطبع نول کشور سے غالب کا کلیاتِ نظم (فارسی) پہلی بار ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا۔ یہ اسی اڈیشن کا ذکر ہے۔ اس کے "خاتمۃ الطبع" کی عبارت بھی مولوی ہادی علی اشک ہی کی ہے۔ پورا شعر جو کلیات کے ص ۱۸۴ پر درج ہے، یہ ہے ؎

ساغر پئے صبوح لبالب کنم زمے
چوناں کہ لب ز زمزمۂ یا ابوالحسن

شوق مرحوم شاید اسی مغالطے میں ہیں کہ غالب کی عدم توجہی یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے "یہ غلط لفظ (پہلی بار) اپنی غلط حالت کے ساتھ چھپ گیا" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر اسی ("غلط لفظ") کے ساتھ اٹھارہ سال پہلے چھپ چکا تھا۔ جیسے غالب کے

دیوانِ فارسی مطبوعہ مطبع دارِ سلام شاہجہاں آباد ۱۸۴۵ء کے ص ۱۳۲ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۸۴۵ء میں قصیدے کا عنوان تھا۔ " در منقبت امیر المومنین علی علیہ السلام "

اور ۱۸۶۳ء میں صرف "قصیدۂ پنجم در منقبت"۔

غالبؔ کی عربی دانی کچھ ایسی ہی تھی۔

(۳)

متعلقاتِ غالبؔ۔ کالی داس گپتا رِضاؔ بمبئی ۱۹۷۸ء

ص ۱۳۱ پر دیوانِ ذکا (اُردو) کے تحت مَیں نے تفصیل سے لکھا تھا کہ جناب عبدالرزاق بسمل (ذکا کی ہمشیرہ کے نواسے متوفی ۲۷ جولائی ۱۹۶۳ء) اور جناب ضیاء الدین شکیب (بحوالہ سب رس۔ غالب نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۶۴) فرماتے ہیں کہ ذکا شاگردِ غالبؔ نے اپنا اُردو کلام جمع کرنے کی کوشش نہ کی اور اسے قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔ اس خیال کی تردید میں مَیں نے بتایا تھا کہ ذکاؔ نے اپنا اُردو کلام پورے انہماک سے جمع کیا تھا اور اسے مکمّل دیوان کی شکل دی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ جناب مالک رام کے پاس تھا اور ایک قلمی نسخہ میرے کتب خانے کی زینت ہے، اور کہ انھیں اپنے اُردو کلام سے پوری دلچسپی تھی جو آخر تک قائم رہی۔ اب تذکرۂ اشاراتِ بینش (مؤلّف سیّد مرتضیٰ بینشؔ، مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی۔ ص ۴۷) سے مزید انکشاف ہوتا ہے کہ ذکاؔ نے اردو دیوان اوّل اوّل ۱۷ سال کی عمر میں ترتیب دیا تھا۔

مؤلّفِ تذکرہ بینشؔ، ذکاؔ کے اوّلین اساتذہ میں سے تھے۔ انھوں نے یہ تذکرہ ۱۲۶۵ھ (مطابق ۴۹-۱۸۴۸ء) میں مکمل کیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"..... از روے انصاف می گویم نہ بپاسِ شاگردی
کہ فی زماننا، عدیلش نمی بینم ..... در زبانِ ریختہ

ہم دیوانے ترتیب دادہ ..... تاریخ تدوینش چشم بینش روشن، یافتم و ذہینؔ نیز بصنعت تعمیر تاریخش خوب گفتہ "ہمہ اشعار ذکاؔ بے عیب است"....."

تدوین دیوان کی تاریخ "چشم بینش روشن" سے ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اور ذہینؔ کی تاریخ "ہمہ اشعار ذکاؔ بے عیب است" سے بھی ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ (ہمہ اشعار ذکاؔ = ۱۳۴۳ اس میں سے عیب = ۸۲ نکالنے سے ۱۲۶۱ھ مستخرج ہوا) ذکاؔ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۲۶۱ھ میں ان کی عمر صرف ۱۷ سال کی تھی۔ اس عمر میں پورا دیوان ترتیب دے دینے کے معنی یہ ہوئے کہ ذکاؔ بچپن ہی سے انتہائی زرخیز ذہن رکھتے تھے۔

جس دیوان ذکاؔ (نسخۂ راقم) سے میں نے (متعلقات غالب ص ۱۵) انتخاب کلام اخذ کیا ہے اس میں ایک نظم (مرثیۂ غالب) ۱۸۶۹ء کی بھی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس میں ۱۲۶۱ھ والا دیوان شامل ہے یا یہ اس کے بعد مرتب کردہ دوسرا دیوان ہے، کیونکہ تذکرۂ اشارات بینش میں ذکاؔ کے دیوان ریختہ کا کوئی انتخاب شامل نہیں۔ اس تذکرہ کا موضوع فارسی گو شعراء ہے۔

(۴)

بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب مرزا جعفر حسین ۱۹۷۸ء

"آزاد آب حیات میں غالبؔ کے اُردو کلام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

..... دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے..... سررشتہ دار تھے۔

۱؎ ذہینؔ تخلص پورا نام علی دوست تھا۔ حکیم شفا دست خان کے بیٹے تھے۔ ذکاؔ سے سال بھر چھوٹے تھے اور بینشؔ کے تلامذہ میں سے تھے۔

اسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔
یہ مرزا قتیلؔ کے شاگرد تھے۔۔۔۔۔ انھوں نے مرزا (غالبؔ)
صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔
۔۔۔۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب
نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب
کیا۔ وہ، یہی دیوان ہے جو کہ ہم عینک کی طرح آنکھوں سے
لگائے پھرتے ہیں"۔

اس انتخاب کی تائید و تردید میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یہاں اس سے غرض نہیں۔ صرف مرزا خانیؔ کے تعلق سے ایک عبارت نقل کرنا ہے۔ مرزا جعفر حسین (ص ۳۷) لکھتے ہیں:-

"مرزا غالبؔ سے ان (مرزا محمد عسکری) کو عشق تھا۔ غالبؔ نے
۱۸۶۹ء میں وفات پائی تھی۔ اور مرزا (محمد عسکری[1]) صاحب اسی سال
غالبؔ کی وفات کے تھوڑی ہی مدت بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ فرمایا
کرتے تھے کہ مرزا غالبؔ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔۔۔۔ فرماتے
تھے کہ میرے دادا مرزا خاں المعروف بہ مرزا خانیؔ دلّی میں کوتوال
شہر کے منصب پر فائز تھے۔۔۔۔۔ جیّد عالم اور مستند ادیب
تھے۔ مرزا غالبؔ نے اپنے اردو دیوان میں کانٹ چھانٹ کا
فریضہ جن اساتذہ کے سپرد کیا تھا ان میں مرزا خانیؔ بھی تھے۔
۔۔۔۔ ذوقؔ اور شاہ نصیرؔ کے ساتھ متعدد مقامات پر مرزا خانیؔ
کا بھی ذکر آتا ہے۔ شاہ نصیرؔ کے ایک قصیدے کا یہ شعر انھوں نے

---

[1] یہ وہی مرزا محمد عسکری ہیں جنھوں نے رام بابو سکسینہ کی گراں قدر تالیف کا اردو ترجمہ "تاریخِ ادب اردو" کے نام سے کیا ہے۔ "ادبی خطوطِ غالبؔ" بھی انھیں کی تالیف ہے۔ لکھنؤ میں یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔

مجھے (مرزا جعفر حسین کو) کئی بار سنایا تھا ۔

نصیر الدین بے چارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

مرزا (محمد عسکری) صاحب فرماتے تھے کہ کچھ مسلح لوگوں نے ۔ جو انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے آئے تھے کسی بدگمانی کی بنا پر شاہ نصیر کا گھر گھیر لیا تھا اور ان (محمد عسکری) کے دادا میرزا خانی نے اس ہنگامے کو فرو کر دیا تھا یہ شعر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ... دلّی کی تباہی کے بعد (مرزا خانی) لکھنؤ چلے آئے تھے ... لکھنؤ آ کر اسی مکان میں مقیم ہوئے تھے جو اب تک عبد العزیز روڈ پر موجود ہے ۔ اور جس میں آج بھی (۱۹۷۸ء) ان کے پرپوتے مرزا وصی رہتے ہیں ... اس وقت یہ ایک چھوٹا مکان تھا ۔ ... اب ایک عالیشان املاک ہے "

(۵)

مآثر صدیقی ۔ حصّۂ دوم ۔ نول کشور ۱۹۲۴ء ص ۱۵

" ... زمانۂ آغازِ ملاقات میں والاجاہ (نواب صدیق حسن خاں) ایک بار مرزا غالب مرحوم کے دولت خانے پر خانۂ بے تکلّف سمجھ کر بلا اطّلاعِ سابق یکایک پہنچ گئے ۔ اس وقت یارانِ رنگین طبع کی محفل گرم تھی ۔ مرزا صاحب نے ان کو دیکھ کر بے ساختہ یارانہ لہجے میں کہا ع بیا برادر آ ؤ رے بھائی ، اس وقت آپ کی کیا دعوت کروں ۔ پہلے سے مجھ کو آپ کے آنے کا علم بھی نہ تھا ۔ خیر بیٹھیے میں ضیافتِ طبع کیے دیتا ہوں ۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جو انھیں دنوں میں

شاہی دربار کی فرمائش سے لکھی تھی۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

والاجاہ (نواب صدّیق حسن خاں) اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کا وہ دل آویز لب ولہجہ اور ان کے فصیح و بلیغ اشعار کا حسنِ ترتیب واداا اور لطایفِ شعریہ اور جزالتِ معانی کی تاثیر ...... دل میں پیوست ہو گئی ہے۔"

"مآثرِ صدّیقی" ، نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادے کی تصنیف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ داستان نواب صاحب کی عظمت بڑھانے کے لیے گھڑلی گئی ہے۔ مگر واقعے اور شعر کی سنین کی مطابقت ظاہر کرتی ہے کہ کچھ افراط و تفریط سے قطع نظر کر کے تمام واقعہ قابلِ قبول ہے۔ اسی کتاب کے ص ۸ پر لکھا ہے کہ "اکیس سال کی عمر میں (نواب صدّیق حسن خاں) ..... دہلی سے اپنے وطن قنوج میں واپس آئے" دلّی میں دو ڈھائی سال کی عمر میں قیام (ص ۱۳) رہا اور غالب سے ملاقات "زمانۂ آغاز" (ص ۱۵) میں ہوئی۔ گویا ۱۹ سال کی عمر میں صدّیق حسن خاں نے غالب سے ملاقات کی۔ چونکہ صدّیق حسن خاں کی ولادت ۱۸۳۲ء کی ہے۔ لہٰذا ملاقات کا سال ۱۸۵۱ء ٹھہرتا ہے۔ اور اسی سال (اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء) غالب اپنی یہ غزل نبی بخش حقیر کو ایک خط میں بھیجتے ہیں۔ (دیکھیے نادراتِ غالب ص ۱۳) یوں بھی ۱۸۵۵ء (نسخۂ رام پور جدید) سے پہلے یہ غزل غالب کے کسی مطبوعہ یا قلمی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں۔

(۶)

کاروانِ خیال۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبۂ احباب لاہور ص ۹۳

"شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان (مولانا شبلی مرحوم) کے حصّہ میں آیا تھا، اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان

میں فارسی شاعری غالبؔ پر نہیں، ان پر ختم ہوئی۔ کئی مرتبہ مجھے
خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو ان کا وزن
شعرِ فارسی میں غالبؔ سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالبؔ جو کچھ
ہے تغزّل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا
نے ..... فکر و تخیّل کے نئے نئے میدان پیدا کیے
.... غزل میں تو یقیناً مولانا کے ہاں غالبؔ سے
کہیں زیادہ سرخوشی و کیفیت ہے اور حقائق و واردات کے
لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے ......"

مولانا آزاد نے یہ رائے مولانا حبیب الرحمان شیروانی کے نام ایک خط[1] میں ظاہر کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیروانی مرحوم نے آزاد کی رائے سے اتّفاق نہیں کیا۔ اگرچہ کھل کر نہیں کہا مگر جواب[2] سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے خط میں شیخ علی حزیںؔ کی بے حد تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ ہند کے معترضین شیخ حزیںؔ کے سامنے "زاغ و بلبل" کا حکم رکھتے ہیں۔ شیروانی مرحوم نے غالبؔ اور شبلی کے موازنے کو پسِ پُشت ڈال کر دو ہی جملوں میں بات صاف کر دی، کہتے ہیں۔

"شعر العجم میں علاّمہ (شبلیؔ) مرحوم نے شیخ (علی حزیں)
کو نہیں مانا، مَیں نے ٹوکا۔ ایک بار سے زیادہ (میں نے) بنارس
میں مزارِ شیخ (علی حزیں) دیکھا ہے اور اس کو غزلِ فارسی کا مدفن
محسوس کیا ہے......"

شیخ علی حزیںؔ کے مزار کو 'غزلِ فارسی کا مدفن' کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ شیروانی کے نزدیک حزیںؔ کی غزل کے مقابلے میں غالبؔ اور شبلیؔ دونوں کی فارسی غزل ناقابلِ اعتنا تھی اور شعر العجم میں شیخ علی حزیںؔ کو نہ ماننے پر شیروانی کا شبلیؔ کو ٹوکنے کا مطلب یہ ہوا کہ اُنھیں شبلی کی فارسی شاعری کے متعلّق آزاد کی رائے سے اتّفاق نہ تھا۔

---

[1] محررہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۰ء [2] محررہ ۶ دسمبر ۱۹۴۰ء

(۷)

عمرِ گذشتہ کی کتاب۔ مرزا ظفر الحسن۔ حیدر آباد ص ۱۹۸

فیض کہتے ہیں۔۔۔۔ " یہ تو غالب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ تصوّرِ جاناں کے لیے فرصت کے رات دن، بھی شرط ہیں۔۔۔۔"

یہ بیان، غالب کے اس شعر سے مستعار ہے جس کا پہلا مصرع عام طور پر اس طرح پڑھا جاتا ہے ع دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

حالانکہ صحیح شعر یوں ہے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

کہ رات دن،، دوسرے مصرع کا حصّہ ہے۔

شعر کہنے کا یہ اسلوب اساتذہ کے نزدیک مستحسن نہیں تاہم غالب نے اسی کو حُسن بنا دیا ہے۔ غالب کے اسی قبیل کے چند اور شعر سنیے ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

(٨)

تلاشِ غالب۔ نثار احمد فاروقی۔ مئی ۱۹۶۹ء ص ۱۸۹

"غالب کے ہم عصروں میں ضلع بجنور کے ایک شاعر احمد حسن رسوا تھے، جو فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا فکر معمولی ہے اور فنی اعتبار سے بھی کلام بلند نہیں۔ ان کا دیوانِ اردو طبع ہو چکا ہے اور فارسی کا دیوان بھی مطبع نول کشور نے شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے غالب کی متعدد زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور کئی جگہ غالب سے خوشہ چینی بلکہ اس سے بہتر کہنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔۔۔۔۔ اس دیوان کی ترتیب ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں ہوئی لیکن ورقِ اوّل پر لکھا ہے:

"دیوانِ رسوا۔۔۔۔۔ حسبِ فرمائش نواب علاؤ الدین خان
بہادر فرمانروائے لوہارو۔۔۔۔۔ بہ ماہ جنوری ۱۸۹۹ء۔۔۔
مطابق ماہِ رمضان ۱۳۱۶ھ"

فاروقی صاحب نے آخر میں رسوا کے دیوانِ فارسی سے ہی ایسے اشعار دیے ہیں جن میں "غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔" معلوم ہوتا ہے فاروقی صاحب کی نظر سے رسوا کا دیوانِ اُردو نہیں گزرا۔ میرے کتب خانے میں اس کی ایک جلد ہے۔ کتاب کا نام دیوانِ رسوا ہے اور ورق اوّل کی آخری سطریں یہ ہیں:

"من تصنیف جناب مولانا مولوی احمد حسین صاحب متخلص بہ رسوا
خلف الصدیق جناب مولوی محمد حسن صاحب بیدار بجنوری۔۔۔۔۔
مطبع صادق الانوار بہاولپور میں باہتمام حافظ عبد القدوس قدسی
سپرنٹنڈنٹ کے چھپا۔"

دراصل رسوا کے دیوانِ اردو دو تھے مگر اس دیوان میں دونوں کو ملا دیا گیا ہے۔ "گویا شیر و شکر ایک جگہ ہو گئے ہیں۔" دیوان کے آخر میں گوری شنکر سہائے مجذوب (برادر خورد چنی لال مائل)

اُلفت علی گویاؔ، شاگردِ رسواؔ حافظ عبد القدوس قدسیؔ کی تقریظیں اور گوری شنکر سہائے مجذوبؔ، اُلفت علی گویاؔ، چنی لال مائلؔ اور محمد جعفر ذکیؔ شاگردِ رسواؔ کے قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔ تمام مادوں سے ۱۲۹۷ھ یا ۱۸۸۰ء مستخرج ہوتا ہے۔ مگر طباعت کی تاریخ ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء ہے۔ غزلوں کے کئی مقطعوں میں مومنؔ اور ذوقؔ کا نام بھی آتا ہے۔ مگر غالبؔ کا نام زیادہ جگہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسواؔ کو غالبؔ سے خاص عقیدت تھی۔ اگرچہ تقریظوں میں رسواؔ کے احباب نے رسواؔ کو غالبؔ اور دوسرے اساتذہ پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے مگر خود رسواؔ نے کہیں اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ذوقؔ پر مومنؔ کو اور دونوں پر غالبؔ کو ایک طرح سے ترجیح دینے کی کوشش صاف دکھائی دیتی ہے۔

شک تو نہیں کچھ ذوقؔ کی استادی میں رسواؔ
پر حضرتِ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

رسواؔ ہم اس کا عہد جو پاتے تو دوڑ کر
لیتے ضرور مومنؔ استاد کے قدم

ہے ریختہ میں مومنؔ و غالبؔ کا خوشہ چیں
رسواؔ یہ بات ہے ترے عقل و شعور کی

رسواؔ کہاں ہیں مومنؔ و غالبؔ کہاں ہیں ذوقؔ
مدفوں مثالِ گنج یہ سب پاک ہو گئے

گلشنِ لہجۂ غالبؔ میں عجب ہے رسواؔ
مثلِ بلبل کے ترا نغمہ سرا ہو جانا

زمانہ غالبؔ آتش زباں کا یاد آتا ہے
دلِ پُرغم میں رسواؔ شعلہ زن ہے بار بار آتش

رسواؔ بقولِ حضرتِ غالبؔ نہ ہو ملول
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچّھا کہیں جسے

لکھا جو اس غزل میں تو نے رسواؔ بس غنیمت ہے
زمینِ شعر ہے غالبؔ سے استادِ سخن ور کی

رسواؔ نے غالبؔ کی اکثر غزلوں پر غزلیں کہی ہیں مگر غالب کی ٹکّر کے تو کیا فنّی لحاظ سے چست اور ریختہ شعر بھی ڈھونڈے ہی سے ملتے ہیں۔ چھ غزلوں سے دو دو اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

پا بہ زنجیر ہوا چاہتا ہوں
یار کا حلقۂ در یاد آیا

ابرِ تر ہو گیا پانی پانی
جب مرا دیدۂ تر یاد آیا

پہلے تو کبھی دیدہ سمندر نہ ہوا تھا
یوں خلق کو طوفاں کا کبھی ڈر نہ ہوا تھا

تو آپ بھی حیرت زدہ ہوتا، یہ ہوئی خیر
آئینہ ترے رُخ کے برابر نہ ہوا تھا

روح ہوگی مری مصروفِ بکا میرے بعد
ہے کسے درد مرا میرے سوا میرے بعد

کس لیے ہو رہے ہیں خارِ بیاباں پیلے
کیا نہ آوے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

جنّت میں تو کچھ دل نہیں کھلنے کا ہمارا
ظالم ترے کوچے سے چلے جائیں کہاں اور

اس بُت کے سوا کچھ نہیں مانگا ہے خدا سے
ہے میری طرف اس کا خیال اور گماں اور

ناخوش ہو یا کہ خوش نہیں انساں کا اختیار
لکھا گیا ہے سب کا مقدر کہے بغیر
کامل ہے جذبِ دل تو یقیں ہے کہ ایک دن
آئے گا میرے گھر وہ ستمگر کہے بغیر

جتنا عتاب اس کا ہے مجھ پر ہے سب روا
مجھ سا جہاں میں ایک گنہگار بھی نہیں
تذلیلِ نفس کے لیے رسوا ہوں ورنہ میں
زاہد نہیں تو رندِ قدح خوار بھی نہیں

---

(۹)

ذکرِ غالب۔ پانچواں ایڈیشن۔ فروری ۱۹۷۶ء ص ۲۷

" (مرزا غالب کی بہن) چھوٹی خانم کی اولاد میں تین صاحبزادے ایک صاحبزادی ہوئی۔ صاحبزادوں کے نام میرزا عاشور بیگ، میرزا جواد علی بیگ ... میرزا عباس بیگ تھے ..."

غالب کے بھانجوں یعنی بہن چھوٹی خانم اور صاحبزادوں کی یہ ترتیب بلحاظِ سِن درست نہیں۔ میرزا جواد علی بیگ سب سے چھوٹے تھے۔ گویا میرزا عاشور بیگ، میرزا عباس بیگ اور میرزا جواد علی بیگ۔ آخر الذکر کا عرف میرزا مغل (بیگ) تھا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب متعلقاتِ غالب ص ۵۳)

(۱۰)

ذکرِ غالب۔ پانچواں ایڈیشن۔ فروری ۱۹۷۶ء ص ۸۶

" بلا مبالغہ اس پنشن کے مقدمے پر اُن (غالب) کا ہزاروں روپیہ اٹھ گیا۔ جس کا بڑا حصہ انہوں نے مہاجنوں سے سود پر

لیا ہوگا...... بدقسمتی سے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوگیا۔ اور ان کی باقی عمر اس قرض کو چکانے میں کٹ گئی......
۱۸۳۵ء میں جب ان کے خلاف پانچ ہزار روپئے کی ڈگری ہوئی تو اس زمانے میں بقول ان کے مجموعی طور پر چالیس پچاس ہزار روپے کا قرض تھا۔"

(ص۔ ۹۰) "۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو غالب پھر جوئے کے الزام میں گرفتار ہوگئے۔"

(ص۔ ۹۳) "غالب کے لیے یہ بڑی سختی کے دن تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ پچھلے بیس پچیس برس سے (مالی مشکلات کی وجہ سے) نہایت پریشانی کے عالم میں بسر کر رہے تھے۔"

(ص۔ ۱۴۱) "(مرزا غالب کی بیوی امراؤ بیگم) نے یکم اگست ۱۸۶۹ء۔ (غالب کی وفات کے ساڑھے پانچ مہینے بعد) نواب (رام پور) کی خدمت میں لکھا کہ آٹھ سو روپے مرزا (غالب) مرحوم کا قرض باقی ہے۔ اس کی ادائیگی کے لیے مدد فرمائی جائے......"

ان اقتباسات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں جبکہ غالب کی عمر ۳۸ سال تھی وہ چالیس پچاس ہزار روپے (جسے آج کا کم از کم بیس[۲۰] لاکھ روپیہ کہنا چاہیے) کے قرض کے بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور ان کی مالی مشکلات ان کی جوئے کی علت میں اسیری کے بعد تک جبکہ ان کی عمر ۵۰ برس کی تھی قائم رہیں۔ پھر ہمیں یکایک یہ آگہی ہوتی ہے کہ انتقال کے وقت غالب صرف آٹھ سو روپے کے مقروض تھے۔ گویا غالب کو اپنی عمر کے آخری ۲۲ سالوں میں اس قدر آمدنی ہوئی کہ انھوں نے آٹھ سو روپے کے قرض کے علاوہ چالیس پچاس ہزار روپے کا تمام قرض مع سود ادا کر دیا اور تقریباً سُرخ رُو اس جہان سے گئے۔ مگر

(ا) کیا یہ ممکن تھا؟
(ب) اگر تھا تو کیونکر؟

معلوم ہوتا ہے کہ اصل قرض اور غالب کے بیان کردہ چالیس پچاس ہزار روپے کے

مفروضہ قرض میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ محض زیادہ انعام واکرام حاصل کرنے کی غرض سے ایسا لکھ دیا ہو گا۔

(۱۱)

ذکرِ غالب۔ پانچواں ایڈیشن۔ فروری ۱۹۷۶ء

(ص ۱۸۴) " یہ کتاب (لطائف غیبی) ۱۸۶۵ء میں سید سعادت علی کی 'محرق قاطع برہان' کے جواب میں لکھی گئی تھی ......"

جناب مالک رام سے یہاں سہو ہو گیا ہے۔ لطائفِ غیبی، ۲ر اکتوبر ۱۸۶۴ء کو چھپی تھی۔ خاتمے میں لکھا ہے " بتاریخ بست نہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ ہجری طبع شد" اور یہ تاریخ ۲ر اکتوبر ۱۸۶۴ء کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ میرے کتب خانے میں 'لطائف غیبی' کا ایک نسخہ ہے۔ جس کے آخری سادہ ورق پر یہ عبارت درج ہے جو غالباً تفتہ کے متعلقین میں سے کسی کی لکھی ہوئی ہے۔

" فرستادۂ اوستاد، بدست منشی بہاری لال مشتاق موصول شد ۴ دسمبر ۱۸۶۴ء بخانۂ ہرگوپال"

گویا غالب نے بطورِ خاص یہ کتاب چھپنے کے ۲ مہینے ۲ دن بعد منشی بہاری لال مشتاق کی معرفت ہرگوپال (تفتہ) کو بھیجی۔

(ص ۲۰۵) " مداری اور کلّو داروغہ اور کلیان تینوں بہت لمبے عرصے تک ان کے پاس رہے۔ بلکہ کلّو کا انتقال بھی میرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا۔"

یہاں اسی گھر سے مراد وہ مکان ہے جس میں خود مرزا غالب کا انتقال ہوا لیکن

(حاشیہ صفحہ ۲۱ کا) غالب نے یہ اطلاع ایک فارسی خط بنام ناسخ میں دی ہے۔ دیکھیے متفرقاتِ غالب مطبوعہ ۱۹۴۷ء ص ۱۰۰۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب

کلّو تو غالبؔ کی وفات کے برسوں بعد مرا اور اسی گھر میں اس کی سکونت کا امکان سال دو سال سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا کیونکہ غالبؔ کی بیگم کا انتقال غالبؔ کی وفات کے پورے سال بھر بعد ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں جناب مالک رام کو تفصیلی خط لکھا۔ پھر جب میں دہلی گیا تو ۳۰؍ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو از سرِ نو یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا اور انھوں نے ذیل کی یادداشت تحریر فرمائی۔

"۱۹۳۷ء کے جاڑوں کی بات ہے (شاید ۱۹۳۶ء کے اواخر کی ہو) کہ میں باقر علی خاں مرحوم کی بیوی بگاّ بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھا تھا۔ غالبؔ سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ و رخشاںؔ کے مکان (ضیا منزل) میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے فرمایا کہ کلّو (کلے خاں) غالبؔ کا داروغہ ان کے بعد بھی زندہ رہا اور اس کا اسی مکان میں انتقال ہوا۔ اس وقت میں نے غور نہ کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ کلّو کا 'ضیا منزل' میں انتقال ہوا۔ (نہ کہ غالبؔ کے آخری سکونتی مکان میں)"

(۱۲)

ارمغانِ بے بہا۔ ۱۲۸۹ھ از منشی دین دیال

(۱) غالبؔ اور مومنؔ کی موجودگی میں اور ذوقؔ کی زندگی اور پھر وفات کے بعد بھی کافی عرصے تک ذوقؔ کا مقام بطورِ شاعر بہت بلند رہا۔ گلدستۂ نازنیناں اور آثار الصنادید نے ذوقؔ کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ "اب فی زمانہ خصوصاً دہلی میں کوئی اس (ذوقؔ) کے مقابلے کا نہیں" اور یہ بلندیٔ شعر "متقدمین سے متاخرین تک کسی اور فرد کو حاصل نہیں ہوئی"۔ یہ ذوقؔ کے معاصروں کے تبصرے ہیں اور اس زمانے کے مذاقِ سخن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ایسا ہی ایک بے ساختہ تبصرہ "ارمغانِ بے بہا" کے ص ۲۴ پر ملتا ہے۔ یہ ۵۰ صفحے کا قدیم رسالہ منشی دین دیال میر منشی اجنٹی ریاست بھوپال کے فارسی خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔ منشی دین دیال میر منشی امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے اور فارسی کے اچھے انشاء پرداز تھے۔ سیہور (علاقہ اجنٹی بھوپال) میں رہتے تھے۔ اگرچہ یہ خط ۱۲۸۹ھ میں شائع ہوئے مگر یہ لکھے ہوئے بہت پہلے کے تھے۔ یہ خط جس کا اقتباس یہاں درج ہو رہا ہے مولوی محمد نواز مدرس اوّل مدرسۂ سیہور کو لکھا گیا ہے۔ خط کے متن سے (جس کا اقتباس یہاں نہیں دیا جائے گا) معلوم ہوتا ہے کہ منشی جی مولوی محمد نواز سے اپنے مسودے اصلاح بھی کرایا کرتے تھے۔

قیاس چاہتا ہے کہ یہ خط ۱۲۷۹ھ یا ۱۲۸۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسی زمانے میں دیوانِ ذوق مرتبہ دیرآں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔

"دیوانِ ذوق کہ از عذوبتِ کلام چوں کاغذ قند شکر آمیز است
واز نمکینیِ استعارات چوں طعنۂ حاسداں بہ زخمِ منکراں نمک
ریز، بخدمتِ خدام مخدوم الانام می رسانم ......"

(ب) انھیں منشی دین دیال کی تحریک پر منشی ہر نرائن حقیر دہلوی نے اپنے بعض خطوط "خیالاتِ نادر" کے نام سے منشی نول کشور کے مطبع سے مارچ ۱۸۸۲ء مطابق ربیع الآخر ۱۲۹۹ھ کو شائع کرائے۔ مسودہ ۱۲۹۷ھ میں مکمل ہو چکا تھا۔ حقیر کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ ملاحظہ کیجیے ؎

چو پرداز ایں نثر را ختم کردم	بفضلِ خدائے توانا و قادر
حقیر از سنینِ بنی گفت با من	کہ گو نام و سالش خیالاتِ نادر

۱۲۹۷ھ

حقیر کا پہلا خط مولوی امین الدین امینؔ کے نام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی امین الدین امینؔ ہر نرائن[1] کے استاد تھے۔ یہ امین الدین امینؔ دہلوی جو پٹیالہ میں مدرس تھے،

[1] ہر نرائن بن لالہ نتھمل بن لالہ موتی رام بن لالہ کشن چند صاحب کایستھ ماتھر دہلوی" (ص ۵۲ خیالاتِ نادر)

وہی ہیں جنھوں نے غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ایک کتاب قاطع القاطع لکھی تھی۔ قاطع القاطع ۔ قاطع برہان کے معرکے کی سب سے پہلی کتاب تھی۔ یہ کتاب (صفحات ۲۶۸) ۱۲۸۳ھ میں مطبع مصطفائی سے چھپی تھی لیکن اس کی تاریخ ترتیب 'فراغ' سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ محرق قاطع برہان میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اتفاق سے قاطع القاطع ہی ایسی کتاب ہے جس کا جواب غالب کی طرف سے نہیں دیا گیا تھا کیونکہ اس کی زبان فحش ہے۔ گدھے کے لات مارنے والا لطیفہ بھی اسی کتاب سے منسوب ہے پھر یہ بھی ہوا کہ اس کتاب کے مصنف پر غالب نے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ اور جب بعد میں واپس لیا تو یہ بات غالب کے لیے اور بھی سبک سری کا باعث ہوئی۔ مقدمے کے گواہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب علم لوگوں میں مولوی امین الدین امین کا رسوخ مرزا غالب سے زیادہ تھا۔

اسی مجموعہ میں ایک خط غالب کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال (مشتاق) کے نام ہے اور تعجب ہے کہ ان سے حقیر نے قاطع القاطع کا ایک نسخہ مانگا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

"شوقِ تماشائے گلزار ہمیشہ بہار قاطع القاطع ہم چناں دامنِ دل می کشد۔ یا رب مطالعہ اش زود نصیب منتظراں فرماید و اشتیاق استفادہ ازاں مفید الانام ہمہ قدر در استیلات خد ایش جلد بر مشتاقان صادر نماید ۔۔۔۔۔"

حالی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ مولوی امین الدین کی طرف سے جو لوگ بطور گواہ غالب کے خلاف پیش ہوئے تھے ان کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے خلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

ہر آنکہ در نگری جز بجنس مائل نیست
عیارِ بے کسیِ من شرافتِ نسبی ست

اس مجموعے کے دوسرے خطوط جو کسی قدر دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں یہ ہیں

(۱) بخدمت شریف لالہ دین دیال صاحب میر منشی اجنٹی بھوپال در شکر ارسالِ نسخۂ ارمغانِ بے بہا از نتائجِ افکارِ ایشاں

(۲) بخدمت شریف منشی دین دیال صاحب در شکرِ عنایتِ نسخۂ صفیرِ بلبل و صحت نامۂ علوی و نخارستان مجدالدین خوافی ـ ـ ـ ـ ـ

(۳) در مبارکباد و عید متضمن بعذرِ غیر حاضری خود بوالاخدمت مولوی امین الدین صاحب ـ ـ ـ ـ ـ

(۴) بخدمت شریف منشی دین دیال صاحب در شکرِ عنایتِ نسخۂ نادرۂ کلیات صہبائی ـ ـ ـ ـ ـ

(۵) بخدمت منشی دین دیال صاحب در تعزیتِ اہلیۂ ایشاں ـ ـ ـ

(۶) بنام لالہ بہاری لال مشتاق در تعزیتِ صبیۂ ایشاں (یعنی دختر مشتاق) ـ ـ ـ

(۷) بخدمت شریف منشی دین دیال صاحب در مبارکبادِ تولدِ نبیرۂ ایشاں ـ ـ ـ ـ

تمام کتاب پرانے ڈھنگ کی انشا پردازی کی حامل ہے اس لیے زیادہ اہم نہیں۔

(۱۳)

رسالہ عبدالواسع از میر عبدالواسع ہانسوی مطبع شعلۂ طور

کانپور ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۸۰ھ

ص ۴۰ ـ ـ ـ ـ "فرق درمیان نفی بکلمۂ نا و بے ـ ـ ـ ـ ـ ـ
لفظ نامراد ـ ـ ـ ـ ـ کہ در عرفِ عام شہرت دارد، غلطِ محض است،
بے مُراد ـ ـ ـ ـ ـ باید گفت ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ "

غالب نے عبدالواسع کے اس قاعدے کی اپنے خطوں میں بار بار مخالفت کی ہے۔
صاحبِ عالم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے

چکلے جناب عبدالواسع، فرماتے ہیں کہ بے مُراد صحیح اور نامراد غلط۔
ارے تیرا ستیاناس جائے۔ بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے
جو زمین و آسمان میں ہے نامراد وہ کہ جس کی کوئی مراد، کوئی
خواہش بر نہ آوے، بے مراد وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سے
سادہ ہو۔۔۔۔۔"

غلام غوث بے خبر کے خط میں تحریر ہے۔

"۔۔۔۔ نامراد اور بے مراد کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع
ہانسوی نے بے مراد کو صحیح اور نامراد کو غلط لکھا ہے۔ میں
لکھتا ہوں کہ ترکیبیں دونوں صحیح لیکن بے مراد غنی کو کہتے ہیں
اور نامراد محتاج کو"

غالب اس میں قطعی حق بجانب ہیں۔ عبدالواسع نے نامراد کو غلط قرار دے کر لغت اور محاورے
کا پاس نہیں کیا۔

(۱۴)

نہر الفصاحت۔ مرزا قتیل۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ

جمادی الاوّل ۱۲۵۸ھ ص ۲۸
(مطابق جولائی ۱۸۴۲ء)

"کدہ بمعنی خانہ باشد، پانچ لفظ ملحق شدہ سوائے آں مسموع نیست
بتکدہ و غمکدہ و آتشکدہ و میکدہ و گلشن کدہ۔۔۔۔"

مرزا غالب کو قتیل کی فارسی دانی سے بے حد چڑ تھی اور وہ قتیل پر وار کرنے کے
لیے ہر موقع تیار رہتے تھے۔ چنانچہ نہر الفصاحت کے مندرجۂ بالا قول کو سامنے
رکھ کر غالب نے قتیل کو خوب خوب غلط گو کہا ہے۔
ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"..... یہ الّو کا پٹھا قتیلؔ صفوتکدہ و شفقکدہ و نشترکدہ کو ..... غلط کہتا ہے ۔" (۲۵ راگست ۱۸۶۲ء)

اس سے پہلے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے خط میں صاحبِ عالم کو بھی لکھ چکے تھے:

"یہ شخص (قتیل) مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ بس آرزوکدہ اور دیوکدہ اور نشترکدہ، اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا ہے وہ نادرست ہے ....." (مارچ ۱۸۵۹ء)

ایک اور خط میں (بذریعہ چودھری عبدالغفور سرورؔ) صاحبِ عالم کو طنزیہ لکھا:

"..... وہ (قتیل) کہتا ہے کہ کدہ کے ساتھ سوائے پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو ۔" (مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء)

غالبؔ نے اس (کدہ) لاحقے کے بیان کو قتیلؔ کی زبان سے نہیں سُنا تھا بلکہ قتیلؔ کی تصنیف "نہرالفصاحت" میں لکھا ہوا پڑھا تھا مگر حیرت ہے کہ جہاں غالبؔ نے متن کی عبارت کو بار بار دہرایا ہے۔ وہاں قتیلؔ کے حاشیے کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے جو نہر الفصاحت کے اسی صفحے پر درج ہے جس پر متن درج ہے قتیلؔ نے حاشیے میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ یہ صرف اصولاً بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ان پانچ اصولوں کے سوائے اساتذہ کے کلام میں جہاں کہیں اس قسم کے مرکبات آئے ہیں وہ انھیں اصولوں کی فروع ہیں۔ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔ اسے متن کے فوراً بعد پڑھنے سے بات واضح ہو جائے گی۔

"یعنی ایں ۵ اصول اند و سوائے ایں پنج آنچہ در کلامِ اساتذہ یافتہ شد فروعِ ایں ۵ باشد، حصر مقصود نیست و فروع در اصل داخل است چوں حیرتکدہ و سنبلکدہ و حسرتکدہ و ماتمکدہ و سیلیکدہ در تحت کدہ و تغافلکدہ جہنمکدہ و بہشتکدہ ہر دو در گلشنکدہ داخل است چرا کہ گلشن جائے گل معنی دارد و ماتمکدہ و عشرتکدہ تحت غمکدہ داخل اند، اوّل مرادف معنی دوم بسبب ضد بودن نظیر بر نظیر است ....."

(۱۵)

دیوانِ غالب مع شرح۔ جوشؔ ملسیانی۔ بار پنجم۔ ص ۲۷۹

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں نے کئی لوگوں کو یہ کہہ کر جوشؔ صاحب کو مطعون کرتے دیکھا ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں اس شعر سے غالبؔ کی مراد یہ لی ہے کہ "موت کا دن مقرر ہے اور وہ رات کو نہیں آئے گی پھر رات بھر نیند نہ آنے کے کیا معنی؟ لیکن جو کچھ شرح میں درج ہے وہ یہ ہے:

"ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی پھر ہم اس کے آنے کا انتظار کیوں کریں۔ مگر ادبی نکتہ اس شعر میں یہ ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے وہ دن کے وقت آئے گی رات تو اس کے لیے مقرر ہی نہیں پھر رات بھر نیند کیوں نہیں آتی ...."

جب دسمبر ۱۹۷۲ء میں میں جوشؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس شعر کی شرح کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "میں ظاہری مطلب تو پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ ادبی طور پر دنؔ اور راتؔ کے تقابل سے استاد اور کیا معنی پیدا کر سکتا ہے، وہ میں نے یہاں بیان کر دیے ہیں۔ شارح کو یہ حق ہی حاصل نہیں بلکہ اس کا فریضہ بھی ہے کہ وہ شعر کی تشریح کرتے وقت اس کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھے" آپ نے طباطبائی کی شرح اٹھائی اور مجھ سے اس شعر کی تشریح پڑھنے کو کہا۔ میں نے ذرا بلند آواز سے پڑھا۔

"شبِ ہجر میں موت اگر نہیں آتی تو وہ معذور ہے کہ اس کے آنے کا جو دن معیّن ہو چکا ہے اس میں تاخیر و تقدیم ممکن نہیں۔ لیکن نیند کو کیا ہوا کہ رات رات بھر نہیں آتی ......"

سُن کر بولے "شاعر زندگی سے بیزار ہو کر موت کی دعا مانگ رہا ہے یا موت سے اس قدر

خائف ہے کہ اس کے خیال سے اسے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ اس ظاہری مطلب میں 'شبِ ہجر' کی تخصیص کہاں سے آگئی۔ ظاہر ہے کہ طباطبائی نے اپنے شارح ہونے کے حق کو استعمال کیا ہے۔ میرا ایک مطلع اس شعر کی ترجمانی کرتا ہے۔

بے سود ارادہ مقتل کا بے کار دُعا مر جانے کی
موت اپنے وقت پر آئے گی بے وقت نہیں وہ آنے کی "

میری حقیر رائے میں جوشؔ صاحب کو یہ بھی بتا دینا چاہیے تھا کہ دن اور رات میں صنعتِ تضاد پائی جاتی ہے کیونکہ غالبؔ کے اس شعر کی خوبیوں میں یقیناً ایک ادبی خوبی یہ بھی ہے۔

---

(۱۶)

مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضا۔ اگست ۱۹۷۶ء ص ۱۶۱

"آپ کا زرِ امداد ---- پہنچا۔ وہ بہت ممنون ہوئے ان کی طرف سے شکر گزاری کا خط لکھ رہا ہوں۔ غالب کا یہ شعر اس محل پر یاد آتا ہے ؎

مروّت کردہ شب ہا بر تو سیرِ بام و در لازم
نمے باشد چراغے خانۂ بے دستگاہاں را"

یہ شعر ظہوریؔ کا ہے۔ غالبؔ کا نہیں مگر غالبؔ کے خطوط میں درج ہے۔ میں یہ بات خطوطِ غالبؔ (مہر ص ۴۹۴) کی سند پر لکھ رہا ہوں۔ ظہوریؔ کے کلام میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ غالبؔ، چودھری عبدالغفور سرورؔ کو لکھتے ہیں۔

"میں جانتا ہوں مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی۔ اس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوریؔ تھا۔ اللہ اللہ فرماتا ہے ؎

مروّت کردہ شب ہا بر تو سیرِ بام و در لازم
نمے باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

یہاں جوشؔ صاحب سے سہو ہوا ہے، پہلے تو اسے غالبؔ کا شعر کہہ دیا۔ پھر خانہ ہائے بے نوایاں" کو "خانۂ بے دستگاہاں" لکھ دیا، یہ شاید اس لیے کہ "یادگارِ غالبؔ" میں حالیؔ نے "خانۂ بے دستگاہاں" درج کیا ہے مگر غالبؔ نے "خانہائے بے نوایاں" ہی لکھا ہے کیونکہ ظہوریؔ نے "بے نوایاں" ہی کہا تھا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ مروت نے تجھ پر لازم کر دیا ہے کہ راتوں کو تو لوگوں کے بام و در پر نظر ڈالے تاکہ تجھ کو معلوم ہو کہ غریبوں کے گھر میں چراغ تک نہیں ہوتا۔

(۱۷)

شرحِ دیوانِ غالبؔ۔ نظم طباطبائی۔ مطبوعہ مفید الاسلام ۱۹۰۰ء

غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

نظم طباطبائی نے اس کی تشریح یوں کی ہے "یعنی میرا جگر تشنۂ آزار ہے اور آبلہ پائی، صحرا نوردی سے اُسے لطف ملتا ہے، اب بھی اسے تسلی نہ ہوئی ایک ایک کانٹے کے پاس میرے تلوؤں سے لہو کی ندّیاں بہہ گئیں لیکن ایذا اٹھانے سے اس کا جی نہ بھرا۔ جگر تسلّی نہ ہوا، خلافِ محاورہ ہے" حقیقت یہ ہے کہ تسلّی نہ ہوا۔ "تسلّی نہ شد" کا ترجمہ ہے[۱]۔ یہ خلاف محاورہ نہیں، قدما استعمال کرتے تھے۔ جیسے میر تقی میرؔ ؎

نہ تسلی ہوا دلِ بیتاب
نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

(کلیاتِ میرؔ۔ نول کشور۔ ۱۹۴۱ء ص ۹۰۲)

حق یہ ہے کہ غالبؔ کا شعر میرؔ کے شعر کا چربہ ہے۔

---

[۱] خود غالبؔ نے لکھا ہے ؎

مردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم
یارب کجا برم لبِ خنجر ستائے را

(۱۸)

گلزارِ سخن۔ جگناتھ فیض۔ مطبوعہ تاریخ ختمِ کتاب ۱۹۰۸ء ص ۱۸۲

"ریاض خیرآبادی کا پہلا دیوان جو غالب کے رنگ میں تھا، تمام و کمال
جناب اسیر (لکھنوی) کا اصلاحی تھا۔ چونکہ آپ کی طبیعت کا وہ اصلی
رنگ نہ تھا اور بقیدِ ردیف و قوافیِ غالب ترتیبِ دیوان کو، مرتبۂ غالب
کے لحاظ سے آپ بدنما و نازیبا سمجھے، اس دیوان کو تلف فرما دیا۔ اسیر
مرحوم کی ہدایت سے صاف و سادی زبان شعر میں فرمانے لگے ...."

غالب کے انتقال کے وقت ریاض کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ اور قرائن سے ثابت ہے کہ غالب کے جواب میں ریاض اپنا دیوان غالب کی زندگی ہی میں کہہ چکے تھے۔ گلزارِ سخن کے مندرجۂ بالا اقتباس سے تین باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) ریاض کا پہلا دیوان غالب کے رنگ میں تھا
(۲) وہ تمام و کمال اسیر لکھنوی مرحوم کا "اصلاحی" تھا
(۳) اور اسے بعد میں بوجوہ ریاض نے تلف کر دیا

خیابانِ غالب (نادم سیتاپوری۔ مطبوعہ کراچی ص ۱۲۳) میں مندرجۂ ذیل تفصیل سے بخوبی ظاہر ہے کہ نمبر ۱ قطعی درست ہے۔ یعنی ریاض نے ایک دیوان غالب کے دیوان کے جواب میں کہا تھا۔ نمبر ۳ یعنی یہ شہرت کہ وہ دیوان تلف کر دیا گیا (نذرِ آتش کر دینے کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی) بھی درست ہے مگر صرف سنی سنائی کی حد تک، کیونکہ اس دیوان کا ریاض کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ دریافت ہو چکا ہے۔ اب رہا نمبر ۲ یعنی یہ کہ کیا وہ دیوان تمام و کمال اسیر لکھنوی کا اصلاحی تھا؟ نادم صاحب (جنھوں نے اس مخطوطے کو دریافت کیا)، تحریر فرماتے ہیں۔

"...... بعض غزلیں اور ابیات ابتدائی حصّہ میں شکستہ خط میں
بھی ہیں اور پھر انھیں دوبارہ خوش خط بھی لکھا گیا ہے ... جا بجا
اشعار قلم زد کیے گئے ہیں۔ اور اصلاحیں بھی موجود ہیں۔ مگر
یہ تمام اوراق بھی اس مخطوطے میں شامل ہیں۔ ان کا لفظ بہ لفظ
ریاضؔ کا لکھا ہوا ہے ...."

نادمؔ صاحب کے بیان سے اس بات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ آیا دیوان اسیرؔ مرحوم کا اصلاحی ہے کہ نہیں۔ اب نادمؔ صاحب ہی کے مضمون سے خود ریاضؔ مرحوم کا بیان ملاحظہ کیجیے

"میں نے ابتدائے سخن کے لیے 'دیوانِ غالبؔ' کو پسند
کیا تھا۔ 'دیوانِ غالبؔ' کے اشعار پر بہ ترتیب قافیہ پیمائی
کرتا، کلام جناب اسیرؔ کو دکھاتا .... مگر .... اکثر اس لیے
پژمردہ واپس ہوتا کہ جناب اسیرؔ بساط نشینانِ صحبت کو
میرے اشعار 'بوجھیے' کہہ کر سناتے ......"

ریاضؔ کا بیان "گلزارِ سخن" کے اس موقف کو کہ دیوان تمام و کمال اسیرؔ کا اصلاحی تھا، تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ مؤلفِ تذکرۂ گلزارِ سخن منشی جگناتھ فیضؔ آغائے سخن وسیمؔ خیر آبادی (برادرِ ریاضؔ خیر آبادی) کے شاگرد تھے اور ریاضؔ کا ترجمہ ان کے لیے وسیمؔ خیر آبادی ہی نے فراہم کیا ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب یہ تذکرہ چھپا تھا اس وقت ریاضؔ (بعمر ۵۶ سال) زندہ تھے۔

(۱۹)

گلزارِ سخن۔ جگناتھ فیضؔ۔ مطبوعہ۔ تاریخِ ختم کتاب ۱۹۰۸ء

اس تذکرہ نما کتاب کے مولف منشی جگناتھ پرشاد فیضؔ ۱۸۵۹ء میں ناگپور کے مقام پر پیدا ہوئے۔ والد کا نام بخشی رام تھا جو ہندی زبان کے ادیب تھے۔ تذکرے کی تالیف کے وقت فیضؔ نائب مہتمم بندوبست اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے

پرکھنڈوہ میں متعین تھے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں نظم و نثر سے گہری دلچسپی تھی۔ وسیم خیر آبادی سے تلمذ تھا۔

گلزارِ سخن میں غالب اور شاگردانِ غالب کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ ذیل میں غالب سے متعلق ضروری مواد دیا جاتا ہے۔ "آبِ حیات" کی پیروی کے علاوہ مولف کا کہنا ہے کہ غالب کے "دیکھنے والوں میں اب بھی کچھ لوگ زندہ ہیں"، جن کی زبانی حالات معلوم ہوئے ہیں۔

ص ۲۹۷ "غالب تخلص۔ مخدوم اعظم، نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ معروف بہ مرزا نوشہ خلف عبد اللہ بیگ خاں۔ آپ افسر اسیاب کی اولاد سے تھے۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے مگر دلی میں شادی ہوئی اس لیے وہیں سکونت اختیار کی۔ آپ کی طبیعت بہت دشوار پسند تھی اور فارسی گوئی میں زیادہ توغل تھا۔ آپ کے فارسی اشعار ظہوری اور مرزا عبد القادر بیدل کے ہم پہلو ہوتے ہیں۔ اوائل میں اردو اشعار میں اسد تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا ابتدائی ریختہ بھی بالکل فارسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

پھر خیالات کی بلندی اور دقتِ مضمون نے اس کو فہم عام سے بھی بالاتر بنا دیا۔ چنانچہ لوگوں کی شکایت کے جواب میں آپ ایک جگہ کہتے ہیں

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آخر میں دوستوں کی صلاح سے صاف گوئی و سادہ بیانی اختیار کر لی تھی اور ایک رباعی بھی اس مضمون میں ہے، فرماتے ہیں ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

حکیم آغا جان عیشؔ جو ایک ظریف الطبع اور خوش مزاج شخص تھے، ایک روز انھوں نے آپ کے روبرو مشاعرے میں غزلِ طرحی میں آپ کی طرف اشارہ کرکے یہ قطعہ پڑھا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

بہر کیف آپکا کلام بلاغت و متانت کا عمدہ نمونہ ہے اور پھر جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ معانیِ کثیر کو الفاظِ قلیل میں آپ بڑے لطف سے ادا فرماتے تھے۔ آپ کے دیکھنے والوں میں اب بھی کچھ لوگ زندہ ہیں۔ جن کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ بہت آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا صاحبِ دیوان اُردو و فارسی گذرے۔ ہم آپ کا کلام آپ کے دیوان سے انتخاب کرکے درجِ گلدستہ کرتے ہیں" اس کے بعد غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت ۔۔۔۔" کے گیارہ شعر درج ہیں۔ (پھر لکھا ہے)

"نواب زینت محل کے بیٹے شہزادہ جواں بخت بہادر کے زمانہ عقد میں آپ نے یہ سہرا کہہ کر ابوالظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ مرحوم کی نذر گزرانا (پھر اس مشہور سہرے کے ۱۲ شعر درج کیے ہیں)۔ بعد ملاحظہ ظفر شاہ نے مقطع دیکھ کر خیال کیا کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کو جو ہمیں نے اپنا استاد اور ملک الشعراء بنایا ہے یہ (مقطع) اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سخن فہمی سے بعید ہے۔ اسی وقت شاہ مرحوم نے ذوقؔ مغفور کو سہرا دکھا کر مقطع کی جانب توجہ دلائی اور دوسرے سہرے کی فرمائش کی۔ چونکہ یہ (ذوقؔ) بھی استادِ مسلّم الثبوت تھے اسی وقت بکمالِ فکر سہرا کہا جس کا آج تک مثل و جواب

نہیں ہوا۔ اور بادشاہ نے اربابِ نشاط کو دونوں سہرے عطا فرما کر شب کو مجلسِ تہنیت میں گانے کا حکم صادر فرمایا، چنانچہ حسب الحکم حضور بادشاہ اربابِ نشاط نے یکے بعد دیگرے دونوں سہرے گائے اور دوسرے روز دلّی بھر میں مشہور ہو گئے۔ مرزا صاحب بھی سخن سنج و سخن فہم تھے اور عہدۂ مصاحبت پر ممتاز ہونے کی وجہ سے بادشاہ مغفور کے مزاج داں ہو چکے تھے۔ فوراً تاڑ گئے کہ مقطع مرا باعثِ تکدرِ طبع شاہی ہوا، اسی وقت یہ قطعۂ معذرت کہہ کر حضورِ بادشاہ میں پیش کیا۔ جس کی خوبیِ نظم نے بادشاہ کے آئینۂ خاطر سے غبارِ کدورت کو دھو دیا۔ (اس کے بعد قطعۂ معذرت "منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی ۔۔۔۔" ۱۲ شعر۔ غزل "جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے" ۱۱ شعر، غزل "حسن مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے" ۱۰ شعر بطورِ انتخاب درج کیے ہیں)"

ص ۲۴۷

"۔۔۔۔ بلاغت میں جس پایہ کا (میر تقی میرؔ) کا کلام ہے، اس پایہ تک سوائے مرزا نوشہ غالبؔ کے کوئی نہ پہنچ سکا۔ غالبؔ بھی اپنے نام کا تھا، جہاں کہیں میرؔ نے جگہ دی ہے تو (غالبؔ) بہت تیز روی سے اس مقام پر پہنچا ہے، جہاں آج تک کسی کے دماغ کا گزر نہیں ہوا۔ اگر میرؔ نے کسی شعر میں بلاغت کا حصّہ لیا ہے تو مرزا نوشہ نے فصاحت کا۔ اگر میرؔ کا کوئی شعر نزاکت اور غلو میں بالا ہے تو مرزا نوشہ کا مذاقِ سلیم اور رنگینیٔ بیان میں اعلیٰ ہے اور جہاں کہیں (میرؔ) نے لاجواب اور بے مثل کہا ہے، وہاں مرزا نوشہ بھی ٹال گئے، اور چونکہ منصف مزاج تھے، سمجھ گئے کہ اب اس کے مقابلے میں نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم اپنے قول کی تصدیق کے لیے (میرؔ) کی اور غالبؔ کی ایک ایک غزل ہم قافیہ و ہم ردیف ذیل میں لکھتے ہیں، ناظرین

ملاحظہ فرمائیں کہ جس قافیہ کو (میرؔ) نے نہایت بلاغت سے فرمایا ہے اسی قافیے کو مرزا نوشہ غالبؔ نے جگہ پاکر کہاں پہنچایا ہے اور جو قافیہ (میرؔ) نے لاجواب فرمایا ہے وہاں غالبؔ نے بھی دم نہیں مارا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(غزل میرؔ۔ یہاں صرف مطلع درج کیا جاتا ہے)

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا　　اب جس جگہ ہے داغ وہاں پہلے درد تھا

(غزل غالبؔ۔ یہاں صرف مطلع درج کیا جاتا ہے)

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا　　عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

حاشیے میں مؤلف "گلزارِ سخن" نے میرؔ کے دو شعروں پر غالبؔ کو مدِ نظر رکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں ؎

"تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں
یہ گرد باد کوئی بیاباں نورد تھا"

میرؔ کے اس شعر کے معنی یہ لکھے ہیں:

ص ۳۴۸ "پشتہ ریگ بادیہ سے وہ تودے مراد ہیں جو صحرا و میدان میں گرد باد سے دب کر جا بجا رہ جاتے ہیں، دیکھیے میرؔ نے اس سچے اور اصلی واقعہ کو، جس کو تغزل سے کوئی تعلق نہ تھا، کس خوبی سے مذاقِ عشق کے پیمانہ میں ڈھالا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گرد باد وحشیِ دشت گرد ہے۔ بلکہ اس عشق

کے صحرا کا ہر صحرا ایک ذرہ اور اس کے دریا کا ہر دریا ایک قطرہ ہے۔۔۔"
پھر غالب کے اس شعر "احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا"

کو میر کے شعر کے مقابل رکھ کر کہتے ہیں۔
"۔۔۔۔۔ مگر مرزا نوشہ نے اس قافیہ کو ایسا کہا ہے جسکی
تعریف نہیں ہو سکتی، جواہر حل کیے ہیں"
"عاشق ہیں ہم تو میر کے اس ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا"
سرد کا قافیہ غالب کی غزل میں نہیں ہے، اس پر جگنناتھ فیض رقمطراز ہیں:
ص ۳۴۹ "حضرات ناظرین! دیکھیے سرد کا قافیہ میر کے مقطع
میں ایسا ہے کہ اس کے مقابلے کا مرزا نوشہ سے ممکن نہ ہوا۔
اسی بات کا اندازہ کر کے اس نے قافیہ کو ہاتھ نہیں لگایا"

(۲۰)

مجموعۂ سخن۔ حصۂ اوّل۔ ماہ مئی ۱۸۹۴ء۔ نولکشور، لکھنؤ

اس کتاب کو پنڈت شیو نرائن ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع لکھنؤ، مولوی محمد حکیم الدین ہیڈ ماسٹر جوبلی اسکول لکھنؤ اور غلام حسنین قدر بلگرامی (شاگردِ غالب) نے "کالن ایل۔ اے۔ براؤننگ ڈائرکٹر سابق سر رشتۂ تعلیم اودھ" کے ایماء کے مطابق "اساتذۂ اردو ساکن لکھنؤ و دہلی کے کلام فصاحت فرجام سے تالیف کیا" تھا۔ پیشِ نظر اکیسواں ایڈیشن ہے جو ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا، پہلی[1] اشاعت کے وقت واجد علی

---

[1] خزینۃ العلوم۔۔۔۔۔۔ از درگا پرشاد نادر میں لکھا ہے کہ یہ مجموعہ پہلے پہل ۱۸۷۲ء میں چھپا تھا۔

شاہ زندہ تھے۔ ۱۸۷۰ء صفحہ کی یہ کتاب "شعرائے متقدمین و سخنورانِ متاخرین" کے کلام پر مشتمل ہے اور آخر میں دقیق لفظوں کے معنی اور شعراء اور اشخاص کا تذکرہ ہے غالب کا ترجمہ ہے۔

ص ۹۴ "غالب تخلص نام ان کا اسد اللہ خاں اور شاہِ دہلی کی طرف سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ہے۔ ۱۷۹۵ء (۱) میں خاص شہر دہلی میں متولد ہوئے (۲)۔ ان کے والد کا نام عبد اللہ بیگ خاں قوم اتراک سے ہیں۔ مرزا غالب کے دادا کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہو کر ہند میں آئے اور لاہور میں معین الملک کے نوکر ہوئے۔ بعدہٗ دہلی میں آکر بادشاہی ملازمت اختیار کی۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے۔ اور دہلی سے اجڑ کر اکبر آباد میں جا رہے۔ مرزا غالب کا سن پانچ برس کا تھا جب ان کے باپ نے قضا کی۔ تب ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں ان کے چچا نے ان کو پرورش کیا۔ وہ از جانب مرہٹہ اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ بعدہٗ لیک صاحب بہادر گورنر جنرل کی جانب سے چار سو سوار کے رسالہ دار ہو کر دو پرگنوں کے جاگیر دار ہوئے۔ آخر کو وہ جاگیر ۱۸۰۶ء (۳) میں ضبط ہو گئی اور اس کے عوض تنخواہ ملنے لگی جب تو مرزا غالب شاہجہاں آباد (۴) میں آکر آباد ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے اور زبانِ اردو میں فقط میر کے معتقد تھے۔ (۵) ۲ ذی قعدہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۶ء کو اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔ اور دیوان قصائد فارسی و غزلیاتِ فارسی اور نثرِ فارسی میں تاریخ مہر نیمروز اور انشائے پنج آہنگ و قاطع برہان و تاریخ دستنبو اور اردو میں ایک دیوان غزلیات مختصر موجود ہے۔"

مجموعۂ سخن کے مؤلف اگر غالب کے اوّلین سوانح نگار نہیں تو کم از کم اوّلین سوانح نگاروں

میں ایک ضرور ہیں۔ یہ حال غالبؔ کے انتقال کے دو تین سال بعد ہی لکھا گیا ہے۔ اور مؤلفوں میں غالبؔ کے ایک شاگرد اور دوست (قدر بلگرامی) بھی شامل ہیں۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت تک غالبؔ کے حالاتِ زندگی (خصوصاً سنین) کے بارے میں خصوصی واقفیت بھی بہت نامکمل تھی۔ کتاب میں ① غالبؔ کا سالِ ولادت ۱۷۹۵ء دیا گیا ہے۔ حالانکہ صحیح ۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر) ہے ② وہ دلّی میں نہیں بلکہ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ③ ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا تھا۔ اس پر انگریزوں نے جاگیر واپس لے لی تھی۔ ④ غالبؔ ۱۸۰۶ء کے فوراً بعد دلّی آکر آباد نہیں ہوئے تھے بلکہ انھوں نے ۱۸۱۲ء - ۱۸۱۳ء میں دلّی میں سکونت اختیار کی تھی۔ ⑤ تاریخِ وفات کا تو کیا ہی کہنا، ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ تو غالبؔ کے انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کے دوبارہ اجراء کا زمانہ ہے۔ (۱۸۶۶ء سہوِ کتابت ہے ۱۸۶۲ء ہی ہوگا) مگر تاریخِ وفات تو بہر حال ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) ہی ہے۔

---

(۲۱)

دیوانِ غالبؔ اردو نسخۂ عرشی مطبوعہ ۱۹۵۸ء

(ص ۲۹۹) مطلع

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیّاد دیدہ ہوں

مقطع

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(کُل اشعار ۹)

ص ۳۸۹ پر عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ غزل بیاضِ علائی سے لی گئی ہے۔ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۹ء میں بھی اس تمہید کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

"میرزا مرحوم نے خواجہ میر دردؔ کی مشہور غزل پر
غزل لکھی تھی جو دیوانِ مطبوعہ میں نہیں۔ اب یہ
غزل اُردو میں اشاعت کے لیے بھیجتا ہوں جو
ابھی ابھی سید زاہد حسین صاحب زاہدؔ نے
مرحمت فرمائی ہے۔ صفدر،

آگے چل کر عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ زاہدؔ صاحب نے اس میں دو شعر میرزا صاحب کی پرانی خارج کردہ غزلوں کے بھی داخل کر دیے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار جو اب دیوانِ غالبؔ اُردو نسخۂ عرشی کے ص ۲۹۹ پر درج ہیں سب سے پہلے رسالہ سخن سنج کے اپریل ۱۹۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ مرزا غالبؔ کے کلام کے ساتھ مولینا شبلی کی ایک غیر مطبوعہ غزل بھی شائع ہوئی تھی۔ جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلیؔ!
حالِ دل، دیکھیے، اظہار نہ ہونے پائے

مولانا شبلی کی غزل کے کُل اشعار سات ہیں۔ ایڈیٹر سخن سنج نے "غزل جناب مرزا غالبؔ مرحوم" اور "غزل مولانا شبلیؔ مرحوم" سے پہلے یہ نوٹ دیا ہے جس سے غزل کے ماخذ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

"غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالبؔ دہلوی و علامہ شبلی رحمتہ اللہ علیہم ضیافتِ طبعِ ناظرین کے لیے ہدیتہً پیش کی جاتی ہیں۔

اور آخر میں ہم اپنے دوست منشی فصاحت حسین صاحب صابری
و معظمی منشی حمید حسن صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں
نے یہ غزلیات عنایت فرما کر ہم کو رہینِ منّت فرمایا۔۔۔"
ایڈیٹر

(۲۲)

کلّیاتِ غالبؔ (فارسی) دوسرا ایڈیشن مطبع نولکشور
۱۲۷۹ھ ۱۸۶۳ء

؎ بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

یہ شعر عام طور پر غالبؔ کا غزل سے بیزار ہونے کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعر اب غزل سرائی ترک کر کے نواب تجمّل حسین خاں کی مدح سرائی شروع کرتا ہے۔ اگر غالبؔ کو غزل گوئی ناپسند تھی تو انھوں نے آگے کے مدحیہ اشعار اسی غزل کی زمین میں کیوں کہے۔ وہ مثنوی کی کوئی زمین استعمال کر سکتے تھے۔

ایسا ہی ایک شعر مندرجۂ بالا کلیات کے ص ۱۶۵ پر بھی ملتا ہے ؎
غزل گر ملال آرد افسانہ گوے
کہن داستاں ہاے شاہانہ گوے

[یعنی اگر تجھے غزل سے ملال ہوتا ہے (اور وہ تجھے پسند نہیں) تو کوئی افسانہ کہہ یا پرانی شاہانہ داستانیں سُنا] اسے بھی غزل کی مخالفت کی دلیل نہیں گردان سکتے۔ یہ شعر غالبؔ کی مشہور مثنوی ابرِ گہر بار کے ساقی نامہ میں سے ہے۔ یہاں باقی اشعار پڑھنے سے مطلب صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے (اے لاابالی خرام) تجھے غزل اچھی نہیں لگتی نہ سہی، تو کوئی افسانہ کہہ لے یا شاہانہ داستان ہائے کہن کہہ لے، کچھ بھی کہہ لے، میری تو صرف یہ خواہش ہے کہ تیری چال کا مستانہ پن اور بڑھے۔

نظم کے لیے بھی غالبؔ نے کچھ ایسا ہی کہا ہے ؎

فسانۂ غمِ دل بے سر و تن افتاد است
سخن بہ نظم چہ اندازۂ بیاں گیرد

(کلیات ص ۳۳۹)

(غمِ دل کے افسانے کا اور چھور کیا۔ اگر اسے 'نظم' میں بھی بیان کیجیے تو ناکافی ہے)
حقیقت یہ ہے کہ یہاں 'نظم' کا اطلاق غزل، نظم، قطعہ وغیرہ ہر صنفِ شعر پر ہوتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کو غزل گوئی بے حد مرغوب تھی۔ اور یہ رغبت انھیں غزل کی مخالفت پر کبھی آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے غالبؔ کے کلام سے غزل بیزاری کی کوئی علامت ڈھونڈنا سعیِ لاحاصل ہے۔

(۲۳)

مکتوباتِ آزاد دیباچہ سیّد جالبؔ دہلوی۔ لاہور، بار دوّم

سیّد جالبؔ دہلوی اپنے دیباچہ (ص ۱۰) میں فرماتے ہیں۔

"خاصکر کلو، کلیانؔ۔۔۔۔ مرزا صاحب (غالبؔ) سے اس قدر مانوس تھے کہ کلوؔ نے ان (غالبؔ) کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری ہی نہیں کی۔ اور ساری عمر ان (غالبؔ) کی یاد اور فاتحہ خوانی میں گذار دی۔ راقم الحروف نے کلوؔ سے بارہا مرزا صاحب مرحوم کے حالات سنے ہیں۔ مگر کبھی اس نے ٹھنڈا سانس لیے اور سخت حیرت ظاہر کیے بغیر ان کا ذکر شروع نہیں کیا۔
(غالب کے) دیوان خانہ میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اترتے تھے۔ اور ان کی (وہ لوگ جو دیوان خانے میں آکر بے حد شور و غل مچاتے تھے۔)

صورت نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ غل غپاڑہ گویا ان (غالبؔ) کی غذائے روح تھا، جس کے بغیر انہیں (غالبؔ کو) کل نہ پڑتی تھی۔ ان لوگوں (دیوان خانہ میں شور و غل مچانے والوں) سے اگر وہ کبھی کچھ کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ جب کوئی نیا مضمون باندھتے تھے اور اس کی مسرّت کے کیف میں بے خود ہو جاتے تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے اور داد لے کر پھر الٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے۔ کبھی ایسا موقع ہوتا تھا، دیوان خانہ میں چند ناخواندہ شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو درکنار اس کی ترکیبِ لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے مگر مرزا صاحب موصوف پر شوق کا وہ غلبہ ہوتا تھا کہ انھی کو سناتے تھے۔ ایک ایک لفظ کی تشریح کر کے بتاتے تھے اور داد لیتے تھے۔ کلّو کا بیان ہے کہ کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوان خانہ میں چڑیا بھی نہیں لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازہ میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا" لو بھئی سنو، کیا مضمون ہاتھ آیا ہے، اور پھر آپ نے شعر پڑھا اور اس کی ضروری تشریح کی اور مطمئن ہو کر پھر کوٹھے پر چلے گئے۔ ملازم چونکہ ان حالتوں سے واقف تھے اس لیے خاموش رہتے تھے، اور بعض اوقات کسی معمولی آدمی کو چپکے سے دیوان خانے میں بھیج دیتے تھے تاکہ مرزا صاحب کی تکلیف رائگاں نہ جائے اور وہ آزردہ نہ ہوں۔ حالانکہ انھی مرزا نوشہ کی نازک دماغی کا یہ حال تھا کہ بعض موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نیّر و رخشاں اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ مبرور اور نواب علاء الدین خاں علائی مغفور جیسے روسائے

بلند پایہ منتیں کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور وہ ایک مصرع
تک زبان پر نہ لاتے تھے۔ اللہ اللہ سچ ہے کہ شاعر اپنے رنگ
میں بادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے......"

یہ دیباچہ جالبؔ دہلوی نے لاہور میں ۱۹ مارچ ۱۹۰۷ء کو تحریر فرمایا تھا۔ دیباچے کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں کہ "کم و بیش بائیس برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ راقم سطورِ ہٰذا نے جس کی عمر ان دنوں دس گیارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی، حضرت آزاد..... کو دیکھا"[۱]

اس بیان سے جالبؔ دہلوی کا سالِ ولادت (۱۹۰۷ء میں سے پہلے ۲۲ سال اور پھر ۱۱ سال کم کرنے سے ایک سال کی کمی بیشی کے ساتھ) ۱۸۷۴ء ٹھہرتا ہے۔ گویا جالبؔ کی ولادت سے کم از کم پانچ سال پہلے غالبؔ انتقال کر چکے تھے۔

سلّو نے یہ باتیں ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ (جبکہ جالبؔ دہلوی ۲۶ سال کے ہوں گے) جالبؔ دہلوی کو بتائی ہوں گی، گویا اس وقت غالبؔ کو اس دنیا سے سدھارے ۳۱ سال ہو چکے تھے۔

غالبؔ میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں۔ (مئی ۱۹۶۱ء):

"..... غالبؔ ..... ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب
امیر حمزہ کی داستان اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال
کی آگئی...... دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب
پیا کرتے ہیں......"

قربان علی بیگ سالکؔ کو لکھتے ہیں (۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء):

"محمد مرزا (پسرِ سالکؔ) پنج شنبہ اور جمعہ کو داستان کے
وقت آجاتا ہے۔ رضوان (پسرِ سالک) ہر روز و شب کو آتا ہے..."

ان اقتباسات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ غالبؔ کو داستانیں پڑھنے سننے کا شوق تھا اور ان کے دیوان خانے میں داستان سرائی کی محفلیں ہوتی تھیں مگر ان کے اوقات مقرر تھے۔ یعنی پنج شنبہ اور جمعہ کے روز وقتِ معینہ پر۔ قیاس ہے کہ داستان

---

[۱] سید بشارت علی جالبؔ دہلوی۔ جولائی/ستمبر ۱۸۷۴ء تا ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء بحوالہ تذکرۂ ماہ و سال

سرائی کی محفلیں رات ہی کو ہوا کرتی ہونگی۔ گفتگو کا بقیہ بیان اَن پڑھ اور وفادار نوکروں کی زیٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ایسے ملازموں میں مبالغہ آرائی عمر کے ساتھ بڑھتی رہا کرتی ہے۔

(۲۴)

اُردوے معلےٰ۔ اکمل المطابع دہلی۔ ۱۸۶۹ء۔ ص ۵۶

" میں بحر ہزج مسدس مجنون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں......

'بابو برج موہن' سوائے اس بحر (ہزج) کے یا بحرِ رمل کے

اور بحر میں نہیں آسکتا وہ شعر میرا یہ ہے

برم چوں نام بابو برج موہن

چکد خونِ دلِ ریش از لبِ من

غالب نے یہ خط تفتہ کو ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو لکھا تھا۔ اس کے جواب میں تفتہ نے غالباً غالب کے بیان کو چیلنج کرتے ہوئے ایک دوسرے وزن میں بابو برج موہن کو کھپا دیا۔ تاہم وہ وزن غالب کی بیان کردہ دونوں بحروں سے باہر نہیں تھا۔ چنانچہ غالب ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں (اردوے معلےٰ ص ۱۰۶)

" وہ جو تم لکھتے ہو کہ

حرفِ بابو برج موہن مے زنم

اور اس کا دوسرا مصرع میں بھول گیا ہوں، مگر قافیہ میں مَن ہے،

یہ شعر غالب کو بُرا معلوم ہوا ہوگا...... جب تک کہ تم نے نہیں لکھا

میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال بات وہی ہے جو میں

اوپر لکھ آیا ہوں...... [۱]"

---

[۱] خیال ہے کہ غالب اور تفتہ نے برج کو فاع کے وزن پر رکھا ہے۔ دراصل برج موہن میں برج کے تلفظ میں ب ساکن اور ر متحرک ہے اس لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ اُردو میں برج کو مفاعِ کے وزن پر لایا جائے۔ تاہم میں یہاں غالب اور تفتہ کے بقول ر ساکن مان کر ہی یہ بات کر رہا ہوں۔ بابو اور موہن کا وزن فعلن ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب کا شعر "بحر" ہزج مسدس محذوف میں ہے نہ کہ ہزج مسدس مخبون" میں۔ غالب نے مخبون غلط لکھا ہے۔ کیونکہ ہزج میں خبن نہیں آتا۔ خبن دوسرے حرف ساکن گرنے کا نام ہے۔ مفاعیلن میں دوسرا حرف متحرک ہے اس لیے خبن کی گنجائش نہیں ہے۔

اب رہا بابو برج موہن کا بحرِ ہزج اور بحرِ رمل کے سوائے کسی اور بحر میں نہ آسکنے کا دعوا، تو یہ بھی غالب کی عروض سے کما حقہٗ واقفیت نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ بابو برج موہن ہزج اور رمل کے علاوہ بھی کئی بحروں میں آسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اردو میں مصرعے میں نے لگائے ہیں

(۱) مضارع مثمن سالم

مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن فاع لاتن
مصائب سے، رنج و غم سے چھٹے بابو برج موہن

(۲) سریع مسدس مکسوف

مستفعلن مستفعلن مفعولن
دنیا سے بابو برج موہن اٹھے

(۳) خفیف مسدس سالم

فاعلاتن مستفع لن فاعلاتن
اب کہاں بابو برج موہن کا ثانی

(۴) رجز مثمن سالم

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن
افسوس بابو برج موہن آج دنیا سے گئے

(۲۵)

مقالاتِ گارساں دتاسی (جلد اوّل) مطبوعہ ۱۹۴۳ء

(ص ۳۴۴) "لاہور کا اُردو اخبار موسوم بہ پنجابی اپنے ایک شمارے (۱۹ مارچ ۱۸۷۳ء) میں ایک مضمون "ہندوستانی شاعری" میں بر سبیلِ تذکرہ تہذیب الاخلاق کی تعریف کرتا ہے۔

تین یا چار شعراء کے سوا مشاہیر شعراء نے فنِ قصیدہ نگاری کو ترقی دینے کے قابل نہیں گردانا۔ آتش نے ایک شعر بھی کسی کی مدح میں نہیں لکھا۔ سودا، ناسخ، جرأت، مومن، ذوق وغیرہ نے قصیدے لکھے تو ہیں لیکن صلے کی توقع کے بغیر۔ غالب کی حد تک یہ کہ اگر مجھے ان کے احباب اور ان کے شاگردوں کا خوف نہ ہوتا تو میں یہ ضرور کہتا کہ اس شاعر میں جہاں اور طرح کی اکمل خوبیاں تھیں، وہاں یہ عیب بھی تھا کہ جب کبھی وہ کسی نواب کسی خان، کسی راے یا کسی مشہور ہندوستانی کا ذکر کرتا تو قصیدے کا رنگ اختیار کر لیتا"۔

یہ بات غالب کے انتقال کے چار سال بعد کی ہے۔ اس سے یہ تو معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ لوگ غالب کے خوشامدانہ مزاج کو پسند نہیں کرتے تھے اگرچہ ایک عام ہندوستانی کے مزاج میں خوشامد کا عنصر عموماً پایا جاتا ہے۔ عام ہندوستانی مزاج کا یہ بھی ایک حصّہ ہے کہ وہ ہر سربرآوردہ ہندوستانی کو اس لعنت سے پاک دیکھنے کا متمنّی ہے۔

یہی گارساں دتاسی (خطبات گارساں دتاسی۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (۱۹۳۵ء ص ۸۱۲) اپنے خطبے میں جو ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء کو دیا گیا تھا، لکھتے ہیں۔

"دوسرے مشہور شخص اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ آپ اسد بھی تخلّص کرتے تھے۔ آپ کا سرور سے دو ماہ قبل ۷۳ سال

کی عمر میں انتقال ہوا۔ موصوف اپنے زمانے کے بہترین انشاء پرداز
اور شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ اہلِ ہند کا خیال ہے کہ موصوف
کی تصانیف ابدالآباد تک زندہ اور باقی رہیں گی۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ ہند غالبؔ کی تصانیف کو کتنا اونچا درجہ دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ غالبؔ ایسے نامور ہندوستانی کے چہرے کو خوشامد کے عیب سے داغدار دیکھنا کس طرح گوارا کرتے۔

اب رہی دوسرے مشاہیر شعراء سوداؔ، ناسخؔ، جرأتؔ، مومنؔ، ذوقؔ وغیرہ کے کسی صلے کی توقع کے بغیر قصیدہ لکھنے کی بات تو گارساں دتاسی کا یہ قول تمام تر درست نہیں کیونکہ سوداؔ اور ذوقؔ نے یقیناً صلہ پانے کی توقع میں قصیدے لکھے۔ ناسخؔ نے اُردو میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ فارسی میں ضرور کہے ہیں اور صلہ پانے کی بات بھی مشہور ہے۔

(۲۶)

فغانِ بےخبر۔ خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ مطبوعہ ۱۸۹۱ء

(۱) (ص ۱۱۱ خط بنام مولوی عبدالرزاق شاکرؔ)

"........ میرٹھ پہنچ کر...... جو موقع ملا، جی نے نہ مانا۔ دو[۲] روز کی رخصت لے کر دہلی آگیا۔ احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی، دو دن میں کیا کیا کرتا۔ بہرحال اور وں سے ایک بار، حضرتِ غالبؔ سے دوبارہ ملا۔ اور انھیں دیکھ کر رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیرِ فانی ہوگئے ہیں۔ اور بڑی بےلطفی یہ ہے کہ سامع بالکل باطل ہے لکھ کر باتیں ہوتی ہیں۔ عرصۂ دراز کے بعد ملاقات ہو، جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے مگر حواس و ہوش بہت درست، طبیعت

اور ظرافت کا وہی عالم، بخلاف مولوی صدر الدین خاں (آزردہ) صاحب کے کہ ان کے حواس میں بھی فتورِ کلّی ہے۔"

(ب) (ص ۱۲۸ بنامِ غالب)

"آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے سُنا کہ اب آپ نے خدّام سے فرمایا ہے کہ کوئی کاغذ ہو، مجھے دکھایا ہی نہ کرو، اس سبب سے تحریر پر جراءت نہ کر سکا۔ دل پر جبر کر کے بیٹھ گیا۔ اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا نہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی ۔۔۔۔"

(ج) (ص ۱۳۰۔ خط بنام غالب)

"کل میں ایٹہ میں تھا۔ مرزا حاتم علی مہر جو اپنے بیٹے کے اس ضلع میں سررشتہ دار کلکٹری ہونے کے سبب سے بالفعل وہیں ہیں، میرے پاس بیٹھے تھے کہ ہرکارہ ڈاک کا آپ کا خط لایا، میں نے پڑھا، انھوں نے سُنا، دونوں نے لطف اٹھایا۔ پہلا مجموعہ (عودِ ہندی) اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے (اُردوے معلّٰی) کا چھپنا بہت مناسب ہوا مگر گستاخی معاف' یہ نام اردوے معلّٰی، نہایت بھونڈا رکھا گیا۔ لالہ صاحب یا بابو صاحب کی تجویز ہو گی۔ آپ نے اخلاق سے دخل نہ دیا ہو گا۔ آپ کی تصنیف اور ایسا بھدّا نام۔ لاحول ولا۔ ارے قبلہ 'قندِ ہندی'، نام رکھا ہوتا یا پھر سے جو چھپا ہے 'قندِ مکرّر' فرمایا ہوتا۔ یہ دونوں نام کیسے شیریں ہیں ۔۔۔۔"

یہاں لالہ صاحب اور بابو صاحب سے مُراد غالب کے ہندو احباب اور شاگرد ہیں۔ لالہ شونرائن آرام، بابو پیارے لال آشوب، لالہ ہرگوپال تفتہ، بابو جواہر سنگھ جوہر یا کوئی اور۔ اس زمانے میں ہندوؤں کی اُردو فارسی دانی کے بارے میں ایسی

ہی رائے رکھی جاتی تھی۔ خود غالبؔ ایک جگہ کہتے ہیں۔ (بنام مجروحؔ) "میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں ۔۔۔۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ حالیؔ فرہنگِ آصفیہ پر ریویو کرتے ہوئے دس قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اُردو ڈکشنری لکھنے کے لیے ان کے نزدیک دو نہایت ضروری شرطیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا لکھنے والا دلّی کا باشندہ ہو اور

دوسری شرط یہ کہ ڈکشنری لکھنے والا اشریف مسلمان ہو، کیونکہ خود دہلی میں بھی فصیح اُردو صرف مسلمان ہی کی زبان سے سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشل حالت اردوے معلّا کو ان کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی ۔۔۔۔[1]"

حالیؔ کی آواز اصل میں انشاؔ کے موقف کی بازگشت ہے۔ وہ دریاے لطافت میں کہہ چکے ہیں کہ دہلی میں ہر کسی کو فصاحت نصیب نہیں ہے۔ اس کے لیے اصل شرط یہ ہے کہ وہ نجیب ہو۔ یعنی اس کے ماں باپ دلّی کے ہوں (ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہندو نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوؤں کے بارے میں انھوں نے اپنا نظریہ الگ سے پیش کیا ہے اور کہا ہے) کہ صاحبِ تمیز لوگ جانتے ہیں کہ چال ڈھال، کھانا پینا، اور گفتگو کا سلیقہ ہندوؤں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے۔ اسی لیے کسی مقام پر بھی ان کے قول فعل کو معتبر نہیں جاننا چاہیے۔

اُردوے معلّا کی پہلی جلد غالبؔ کی دیکھ ریکھ میں مکمل ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نام (اردوے معلّا) بھی غالبؔ کا ہی تجویز کردہ ہے۔ لیکن اگر یہ کسی "لالہ صاحب یا بابو صاحب" نے دیا ہے تو ہمیں ان 'لالہ صاحب یا بابو صاحب' کے ذوقِ صحیحہ کی داد دینی چاہیے۔ اردوے معلّا کے خطوط کی اشاعت کا مقصد ہی یہ تھا کہ پہلے حصّے کے صاف صاف عبارت کے خطوں سے مدرسے کے طلبا فائدہ اٹھائیں اور دوسرے

---

[1] حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری (حالی ایڈیشن ۱۹۶۹ء ص ۳۲) میں بھی لکھا ہے کہ ۔۔۔۔ عربی کے ساتھ فارسی، ترکی، پشتو اور اردو ۔۔۔۔ خالص مسلمانوں کی زبانیں ہیں ۔۔۔۔"

حصّے کی نثر سے "سخنورانِ معنی یاب" لطف اندوز ہوں۔ ایسے مجموعے کا نام اُردوے معلّٰے سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ بےؔ خبر نے اپنے خطوط کے مجموعوں کا نام "فغانِ بےؔ خبر" اور "خونتابۂ جگر" رکھا ہے تو مذاقِ سلیم سر پیٹ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر بےؔ خبر کا یہ کہنا بھی قطعی نادرست ہے کہ اُردوے معلّٰے عودِ ہندی کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ عودِ ہندی میں کل خط ۱۶۶ ہیں جب کہ اُردوے معلّٰے میں ۴۸۰ خط ہیں۔ عودِ ہندی میں ۲۲ مکتوب الیہ ہیں اور اُردوے معلّٰے میں ۹۱ کم۔ اس کے علاوہ دونوں کی نوعیت اور نصب العین میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

(د) بےؔ خبر نے فغانِ بےؔ خبر کے خطوں میں کہیں کہیں غالبؔ کے شعر بھی لکھّے ہیں۔

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ	مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے
عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا	ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی	کچھ ہماری خبر نہیں آتی
خزاں کہتے ہیں کس کو فصلِ گُل کیا کوئی موسم ہو	وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ایک شعر میں تحریف کی ہے ؎

اپنے دل پر ہی جب نہ ہو قابو	کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

غالبؔ کا مصرعِ اوّل یہ ہے ؎ جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ

بےؔ خبر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے، غالبؔ ان کی عزّت بلکہ چاپلوسی کرنے پر مجبور تھے، ورنہ علمی ادبی حیثیت سے بےؔ خبر بمقابلۂ غالبؔ قطعی پستہ قد تھے۔

(۲۷)

یادگارِ غالبؔ از حالیؔ۔ مطبوعہ ۱۸۹۷ء نامی پریس کانپور ص ۱۱۴

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

میں (حالیؔ) نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے۔ فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے ۔۔۔۔۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ اگر وہ (غالبؔ) اے کی جگہ جز کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرعہ اس طرح کہتے۔

'اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے'، تو مطلب صاف ہو جاتا ۔۔۔۔ مگر مرزا معمولی اسلوبوں سے تابمقدور بچتے تھے ۔۔۔۔۔۔"

حالیؔ کے اس بیان کو لوگوں نے عام طور پر معتبر نہیں جانا۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں پہلے کہیں اس بیان پر اپنے شک و شبہ کا اظہار کر چکا ہوں، مگر حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ دیوانِ غالبؔ بخطِ غالبؔ (مکتوبہ ۱۸۱۶ء مطبوعہ نقوش لاہور ص ۱۵۹) میں ایک شعر یوں ہے۔

اے عجز! کیا کروں بہ تمنّائے بے خودی
طاقت حریفِ سختیِ خوابِ گراں نہیں

یہی شعر پانچ سال بعد غالبؔ نے نسخۂ بھوپال (مشمولۂ حمیدیہ۔ ۱۸۲۱ء) میں بھی شامل کیا ہے مگر وہاں اے کو جز سے بدل دیا ہے۔ گویا اے کو جز کے معنی میں استعمال کرنا غالبؔ کے یہاں روا تھا۔

(۲۸)

دیوانِ غالبؔ مرتّبہ حامد علی خاں۔ مجلسِ یادگارِ غالب لاہور۔ ۱۹۶۹ء ص ۲۲۸

"دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالبؔ"

حاشیے میں ہے

"اس رباعی کے دوسرے مصرعے کے متعلق بڑا جھگڑا رہا ہے۔ یہ بظاہر حضرت طباطبائی کے عروضی اعتراض سے شروع ہوا جو غالباً غلط فہمی پر مبنی تھا اس کے بعد مختلف حضرات اس مصرع پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ اور انھوں نے رُک رُک کر کے بجائے صرف رُک کر، رکھ کر اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی۔ مگر یہ لحاظ نہ فرمایا کہ اس اصلاح سے رباعی کی جان بھی نکالی گئی ہے۔ دل رک کر بند ہوگیا، تو ایسا ہی مہمل ہے جیسا دل رک کر رک گیا، یا دل بند ہو کر بند ہوگیا، غالبؔ نے دل رک رک کر کہا تھا تو اس طرح ایک ایسے تدریجی عمل کی طرف بلیغ اشارہ کیا تھا جو آخر کار حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہوجانے کی تمہید بنا تھا اور جس کا ذکر کیے بغیر مصرع قطعاً بے کیف رہ جاتا ہے۔ عروض خواہ کچھ کہے رُک کر، کو، رُک رُک کر کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔"

مرتب دیوان کے حاشیے کی عبارت سے مندرجہ ذیل باتیں مستخرج ہوتی ہیں۔ جن کا باری باری جائزہ لیا جائے گا۔

(ا) اس رباعی کے دوسرے مصرع میں ایک سبب بڑھ جانے کا اعتراض "غلط فہمی پر مبنی" ہے۔

(ب) بعض حضرات نے رک رک کے بجائے صرف رک کہہ کر اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی مگر دل رک کر بند ہوگیا تو ایسا ہی مہمل ہے

جیسے دل رک کر، رک گیا۔"

(ج) غالب نے دل رک رک کر کہا تھا تو ایک ایسے تدریجی عمل کی طرف بلیغ اشارہ کیا تھا جو آخر کار حرکتِ قلب کے کا ملاً بند ہو جانے کی تمہید بنا تھا .... "عروض خواہ کچھ کہے رُک کر، کو رُک رُک کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔"

آیئے اب اِن امور پر غور کریں:

(ا) دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب میں یقیناً ایک سبب زائد ہے۔ اس اعتراض کا غلط فہمی پر مبنی ہونا کیا معنی؟ اگر یہ مصرع رباعی کے کسی وزن پر پورا اترتا ہے تو اسے آج تک پیش کیوں نہیں کیا گیا؟

(ب) اسلوبِ کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے رک کر نہیں بلکہ رک رک کر ہی کہا ہوگا۔ ان کے یہ مصرعے دیکھیے:

میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔

اگر انھوں نے رک رک کر ہی کہا ہے تو ان سے یقیناً عروضی سہو ہوا ہے لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ انھوں نے دل رک رک بند ہو گیا ہے غالب، کہا ہو۔ ان کے کلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں انھوں نے کر کو محذوف رکھا ہے مثلاً

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گُل دیکھ اسد
رُک گیا دیکھ روانی میری

دونوں جگہ دیکھ بطورِ فعل امر نہیں بلکہ دیکھ کر کے معنوں میں آیا ہے یہ زبان لاکھ پرانی سہی مگر غالب نے اسے روا رکھا ہے اور وہ بھی منتخب متداول کلام میں۔ ان کے یہاں اور بھی متعدد مقامات ہیں جہاں پرانی زبان کے آثار موجود ہیں جیسے۔

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

وغیرہ

(ج) دل کے رک رک کر بند ہو جانے سے غالب کی مراد کوئی "ایسا تدریجی عمل نہیں ہے، جو آخر کار حرکتِ قلب کے کاملاً بند ہو جانے کی "خبر دیتا ہو۔ اگر اس مصرع سے یہ مطلب لیا جائے کہ ہوتے ہوتے دل کی حرکت کاملاً بند ہو گئی تو رباعی کے آخری دو مصرعے

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

قطعی بے کار ہو جاتے ہیں۔ موت کی ابدی نیند کے بعد رات کو نیند نہ آنے کی شکایت اور سونا سوگند ہو جانا بے ربط باتیں ہیں۔ مصرع کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بار بار کے رنج والم سے دل گھٹ کے رہ گیا ہے، اس مصرع میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ غالب کے زمانے میں یا اس سے پہلے اس محاورے اور روزمرّہ کے وہی معنی لیے جاتے تھے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ مثلاً میر حسنؔ ؎

تو رک رک کے دل کو نہ کر اپنے بند
نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند

یا خود غالب کا ایک شعر ؎

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

اب اس رُباعی کے بارے میں کچھ مزید عرض کرنا چاہتا ہوں۔ رسالہ اردو ادب (شمارہ ۳ سنہ ۱۹۶۵ء) میں سحرؔ عشق آبادی مرحوم کا ایک مضمون "غالبؔ کی ایک رباعی" چھپا تھا۔ سحرؔ لکھتے ہیں۔

"غالبؔ کی رباعی ہر شاعر کے لیے ایک پہیلی بنی ہوئی ہے۔ جو جس کے سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا نوشہ اس پر نوٹ لگانا چاہتے تھے لیکن دوسرے مرزا (ہر گوپال سہائے صاحب بھٹناگر تفتہ سکندر آبادی) نے کہا کہ کچھ تو اوروں کو سمجھ لینے کے لیے بھی چھوڑ دیجیے۔ کیا اتنی بات بھی اہلِ نظر نہ سمجھ سکیں گے۔ مرزا نوشہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آخر وہی ہوا جس کا مرزا نوشہ کو شبہ تھا۔

آگے کہتے ہیں:

"اب میں (سحرؔ عشق آبادی) کہتا ہوں کہ رباعی کا دوسرا مصرع (دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ) رباعی کے چوبیس اوزان میں ہے، نہ جدید چھتیس اوزان میں"

پھر کہتے ہیں:

حامد علی خاں صاحب کے استفسار پر محترم نیاز فتح پوری نے [نگار جون ۱۹۵۹ء ص ۳۶] اس مصرع کو ذرا بدل کر یہ وزن رکھا تھا۔

دم رک رک کے بند ہو گیا ہے غالبؔ

مفعولن مفاعلن مفاعیلن فع

لیکن مفعولن مفاعلن یعنی مفعولن کے بعد مفاعلن رباعی کے ۳۶ اوزان میں کوئی وزن نہیں۔"

سحرؔ نے یہ صحیح لکھا ہے، نیاز فتح پوری نے غلط رکن لکھا۔ اسی مضمون میں سحرؔ نے لکھا ہے:

" مرزا غالبؔ نے یہ مصرع، دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ،

یعنی تبکرار رک، ہی لکھا ہے اس میں عروض کا جو نکتہ ہے وہ
طباطبائی سے پوشیدہ نہ تھا۔ انھوں نے عمداً ظاہر نہ فرمایا۔ وہ
چاہتے تو اب تک یہ مصرع معمہ نہ بنا رہتا۔ آخر مجھے یہ معمہ
حل کرنا ہے اور ضرور کر دوں گا۔"

لیکن اس کے بعد سحر صاحب دوسری باتوں میں الجھ گئے اور اس رباعی کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا
گویا یہ معمہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر گیان چند صاحب کو لکھا تھا کہ مجھے اس بات میں ذرا بھی
شبہ نہیں کہ اس رباعی میں ایک سبب زیادہ ہے۔ اور کہ یہ غالب کا سہو ہے،
لیکن میں نے کہیں سے سنا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اس امر کی کوئی
تاویل پیش کی ہے، ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا، ملاحظہ کیجیے۔

"ایک دفعہ شمس الرحمٰن فاروقی سے اس رباعی کے بارے
میں میری بات ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ محقق کے قول کے
مطابق شاعر کو کسی بھی وزن میں ایک سبب خفیف بڑھانے کی
اجازت ہے۔ انھوں نے اس زحاف کا کوئی نام بھی بتایا تھا۔[1] میں
نے کہا کہ میرے علم میں محقق نے ایسا نہیں لکھا۔ ایک حرف
کے اضافہ کا ذکر کیا ہے لیکن میرے سامنے فی الوقت نہیں
آپ دیکھ لیجیے زیرِ کابل عیار ترجمہ معیار الاشعار از محقق (ترجمہ اسیر)
...... لیکن محقق خدا نہیں ہم اس کی بات کو کیوں مانیں۔
"غالب کا مصرع غیر موزوں ہے اگر یوں خواہ مخواہ سبب خفیف
بڑھایا جائے تو سارا عروض ہی درہم برہم ہو جائے گا۔"

---

[1] زحاف کا نام خزم ہے۔ اب اس رباعی پر مبسوط بحث کے لیے میرا مضمون بعنوان "غالب کی متنازعہ
رباعی پر ایک نظر"، مطبوعہ غالب نامہ جولائی ۱۹۸۳ء دیکھیے (رضا)

(۲۹)

دیوانِ غالب۔ پہلا ایڈیشن۔ مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء ص۔ ۲۰

"پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فریاد آیا"

یہ شعر پہلے پہل نسخۂ بھوپال مشمولۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) میں درج ہوا ہے اور میں کہیں ترکیب 'جگر تشنہ' پر سیر حاصل بحث بھی کر چکا ہوں اس میں میں نے بہارِ عجم کے حوالے سے لکھا تھا۔
"جگر تشنہ (بمعنی) کنایہ از بسیار مشتاق فی الملاقات" اور میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ترکیب سوائے بہارِ عجم کے اور کسی لغت میں نہیں اور کہ ٹیک چند بہار مؤلف بہارِ عجم نے کوئی شعر بطور سند نہیں دیا ہے حالانکہ وہ عام طور پر ایسا کرتا ہے۔ لہٰذا کسی فرہنگ نے اس ترکیب کے لیے سند فراہم نہیں کی[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ جگر تشنہ (بمعنی بسیار مشتاق) کی ترکیب غالب نے بہت سی ترکیبوں کی طرح مرزا بیدل کے کلام سے لی ہے چہار عنصر سے بیدل کا ایک شعر دیکھیے ؎

از سبزہ تا نہال، جگر تشنہ اند لیک
بر رشحۂ سحابِ کرم اختیار کیست

یہاں جگر تشنہ کے معنی بہت زیادہ پیاسے اور نتیجتاً بہت زیادہ آرزومند کے ہیں۔ بیدل نے ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔ بہارِ عجم ۱۱۵۲ھ میں تالیف ہوئی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ٹیک چند بہار نے یہ ترکیب بیدل ہی کے یہاں سے لی۔

[1] غالبیات چند عنوانات ص ۱۶۶ — غالب نے اُردو میں اس ترکیب کو مندرجہ بالا شعر کے علاوہ کم از کم دو اور شعروں میں استعمال کیا ہے ؎

(بقیہ صفحہ ۶۰ پر دیکھیے)

نگر سند میں شاید بیدل کا شعر اس لیے نہیں دیا کہ بیدل ایرانی نہیں بالکل ہندوستانی تھا۔ اور اس کی مادری زبان فارسی نہ تھی۔ یوں بھی بیدل کو "خارج آہنگ" سمجھا جاتا تھا اس لیے بہار نے اُس کے کلام سے کم سے کم اسناد بہم پہنچائی ہیں۔

(۳۰)

بزمِ غالب۔ عبدالرؤف عروج۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء

ص ۸۴ پر بہاری لال مشتاق دہلوی شاگردِ غالب کے ترجمے میں لکھا ہے۔

"غالب کے بعض خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی بہاری لال مشتاق کی لیاقتِ علمی معمولی تھی۔ اس سلسلہ میں غالب اکثر ان کو متوجہ کرتے رہتے تھے ایک خط میں ان کو لکھا ہے، چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغلِ تحریر ہمیشہ رہتا ہے بہ تقلید اور انشا پردازوں کے، تمہاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں رہتی ہیں، تم کو جا بجا آگاہ کرتا رہتا ہوں، خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے۔۔۔۔۔۔"

غالب کے خط کے اس ادھورے اقتباس سے یہ اندازہ کرنا ٹھیک نہیں کہ مشتاق کی "لیاقتِ علمی معمولی تھی" غالب نے کہیں اس طرف اشارہ نہیں کیا۔ مشتاق

(بقیہ صفحہ ۵۹ کا)

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

ہر کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگِ ظہور
غنچے کے میکدے میں مست تاملِ بے بہار

اکمل الاخبار، کے مہتمم اور ایڈیٹر تھے اور اچھے خوش نویس بھی تھے۔ ان کی عبارت میں املا کی وہ غلطیاں در آتی تھیں، جو دیکھا دیکھی اخبار والوں کے یہاں راہ پا جایا کرتی ہیں۔ یہاں انھیں غلطیوں کی طرف اشارہ ہے، اس خط کا پہلا حصّہ شاہد ہے کہ غالب، بہاری لال مشتاق کو کم علم نہیں سمجھتے تھے۔

"مجھ کو تم سے محبت ہے، اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تمھارے خالِ فرخ حال منشی سکندر لال میرے بڑے پرانے یار ہیں ...... دوسرے تمہاری سعادت مندی اور خوبی اور حلم اور بقدرِ حال علم، اردو نظم و نثر میں تمہاری طبع کی روانی اور تمہارے قلم کی گلفشانی، مگر چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبارِ اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغلِ تحریر ہمیشہ رہتا ہے ......"

مزید برآں حالی کا انھیں مجموعۂ کلام بھیجنا غالب کا اپنی تصنیف لطائف غیبی میں اور داغ کا گلزارِ داغ میں ان کا قطعۂ تاریخ شامل کرنا، نساخ کا ان کا ترجمہ اپنے تذکرے سخن شعراء میں درج کرنا اور ان سے دلّی میں اپنی ملاقات کا ذکر کرنا، ظاہر کرتے ہیں کہ غالب کے انتقال کے بعد بھی مشتاق کی اپنے ہم عصر مشاہیر کی نظروں میں اچھی قدر و منزلت تھی۔

(ڈ) کلامِ حالی موصول ہونے پر مشتاق نے یہ قطعہ لکھا:

حضرتِ حالی نے بخشا جب مجھے اپنا کلام
اس کو لے کر میں یہ سمجھا، مجھ کو گلدستہ ملا
شاعری میں خضر اے مشتاق! حالی کو سمجھ
شرق کو جس کی بدولت غرب کا رستہ ملا

(کلامِ مشتاق، ص ۶)

(ب) گلزارِ داغ پر قطعۂ تاریخ (۱۲۹۲ھ) دیکھیے:

قطعۂ تاریخ ریختۂ قلم جواہر رقم، درفنِ شعر مشاق منشی بہاری لال، مشاق

زہے شاعرے نغز گفتار داغ | کہ در شاعری مے کند ساحری
پئے طبعِ دیوان جستیم سال | چکید از قلم نسخۂ شاعری

(گلزارِ داغ۔ مطبع انوارِ محمدی، لکھنؤ، ص ۳۲۷)

کتاب معلّم الشطرنج (۱۹۰۱ء) مؤلفہ راجہ بابو، مصاحب مہاراجہ پٹیالہ، کی تقریظ حالی نے لکھی تھی۔ قطعاتِ تاریخ میں ایک قطعہ مشتاق کا بھی ہے۔

(ج) قطعہ تاریخ از خامہ فصاحت ختامہ شاعرِ بے دل، استادِ کامل، سخنورِ شہرۂ آفاق لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی۔

تین نام اس کتاب کے رکھو | جس کی تعریف ہے قرات گنج
دو تو رکھے ہیں خود مصنّف نے | "یارِ شاطر" "معلّم الشطرنج"

۷۲۱ ۷۴۲

"مجلسِ شہ" بھی تم کہو مشتاق | ہے اگر سالِ طبع بیں شش و پنج
تا کہ تاریخِ طبع پیدا ہو | اور فارغ ہو طبعِ گوہر سنج

۴۳۸

۷۲۱ + ۷۴۲ + ۴۳۸ = ۱۹۰۱ء

(د) سخنِ شعراء (نساخ) میں مشتاق کا ترجمہ اس طرح ہے۔

مشتاق تخلص، لالہ بہاری لال، راقم اکمل الاخبار، دہلی، ولد لالہ مَن بھاوَن لال باشندہ دہلی۔ شاگرد مرزا نوشہ غالب، ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔

..... جو تین شعر دیے ہیں۔ ان میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

جہاں جاگے دہیں انگڑائیاں لو | یہاں پھیلائی ہے ہستی کہاں کی

(ہ) "ہندوؤں میں اُردو" (ص ۴۰۸) میں رفیق مارہروی نے مشتاق کے ترجمے میں لکھا ہے "۔۔۔۔۔۔ فتح گڑھ کے رہنے والے تھے، والد کا نام ۔۔۔۔۔۔ منشی دل سنگھ رائے تھا ۔۔۔۔۔ شروع میں حضرتِ مجذوب کے شاگرد ہوئے پھر مرزا غالب سے اصلاح لی ۔۔۔۔"

اور پھر بطورِ نمونۂ کلام تین شعر درج کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے لالہ بہاری لال مشتاق ولد دل سکھ رائے شاگردِ مجذوب مقیم فتح گڈھ اور لالہ بہاری لال مشتاق شاگردِ غالب ساکن دلی کو ایک ہی شخص سمجھ لیا ہے۔ اور جو تین شعر بطورِ نمونۂ کلام دیئے ہیں وہ بھی اتفاق سے مشتاق شاگردِ مجذوب کے ہیں نہ کہ مشتاق شاگردِ غالب کے۔ بقیہ ترجمہ جو یہاں حذف کر دیا گیا ہے، مشتاق شاگردِ غالب کا ہے۔

(و) قربان علی بیگ سالک شاگردِ غالب کے کلیاتِ سالک (۱۲۹۷ھ) میں مشتاق کا ایک برجستہ قطعۂ تاریخ شامل ہے۔ ملاحظہ کیجیے ؎

یہی ہے نظمِ اُردوئے معلّٰے — کہ جس کا آج کل سالک ہے مالک
بجا ہے اس کی چھپ جانے کی تاریخ — "عدیم المثل کلیاتِ مالک"

(ز) "لطائفِ غیبی" کی کتابت مشتاق نے کی تھی۔ اس لیے مشتاق کے تاریخی قطعہ کا عنوان یہ ہے:

"قطعۂ تاریخ از خاکسار بہاری لال، کاتب الحروف عفی عنہ"

یہ چھ شعر کا قطعہ نہایت چابکدستی کے ساتھ کہا گیا ہے اور بہت معنی خیز ہے۔

میاں سیّاح ہو تم کو مبارک — ہوئی جو آپ سے تقریرِ غیبی!
جواب اچھا دیا محرق کا تم نے — غضب سوجھی تمہیں تدبیرِ غیبی
بدی غالب کی یزداں کو نہ بھائی — عدو کو دی ہے یوں تعزیرِ غیبی
ہوا جب ختم چھپ کر یہ رسالہ — کہ جس کی ہر کشش ہے تیرِ غیبی

ہوئی جب فکر سالِ عیسوی کی
نظر آئی مجھے تحریرِ غیبی
سرِ حاسد اڑا کر دیکھو مشتاق
کہ سالِ طبع ہے شمشیرِ غیبی

(ح) نوحہ سرائی سراپا ملال بہاری لال المتخلص بہ مشتاق
(اکمل الاخبار شمارہ ۱۷ مارچ ۱۸۶۹ء بحوالہ اقبال لاہور
مدیر ڈاکٹر وحید قریشی جنوری ۱۹۸۹ء)

مُرد غالبؔ کہ در سخن گوئی
نرسد کس بہ جاہ و اجلالش
روے پُر نور در کفن پوشید
شست و شو داد آہ غسالش

لب فرو است از نوا سنجی
گریہ آید چرا نہ بر حالش

دوش بر دوش نعشِ او می رفت
سینہ کوبان جہاں بدنبالش
سالِ رحلت نمودنش "مشتاق"
گو و مگزار اندر اہمالش
چونکہ او دانشِ مجسّم بود
زاں بود ماتمِ خرد سالش

۱۲۸۵ھ

ایضاً

جس کو سب کہتے تھے غالبؔ آج وہ رنگیں کلام
چھوڑ کر دنیا کو سوے عالمِ بالا گیا

یہ خبر سُن کر مرے دل پر جو گذری کچھ نہ پوچھ
جان لب پر آگئی سینے میں دم گھبرا گیا
روزِ روشن بھی مری آنکھوں کے آگے تھا سیاہ
رات گویا ہو گئی، ایسا اندھیرا چھا گیا
آسماں سے یہ کہا میں نے کہ اے بیداد گر
سچ بتا اس واقعے سے کیا ترے ہاتھ آگیا
ساتھ اس کے اٹھ گئے فضل و ہنر، علم و کمال
تا نہ یہ جانے کوئی دنیا سے وہ تنہا گیا
پھر دُعا کی یہ کہ اس کو بخشیو پروردگار
لفظ "آمیں" ساتھ ہی روح الامیں کہتا گیا
از سرِ الطاف روح القدس نے سالِ مسیح
یوں کہا مشتاق سے "بخشا گیا بخشا گیا"

مندرجہ بالا اشعار میں سے صرف دو شعر (قطعہ تاریخ کلامِ حالی) کلامِ مشتاق میں شائع ہو چکے ہیں اس لیے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے اشعارِ مشتاق کو کلامِ مشتاق میں ضم کر کے دیوانِ مشتاق مرتب کرنے کی ضرورت ہے بہر حال یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ درجِ بالا قطعاتِ تاریخ کے ہوتے ہوئے مشتاق کو کم علم کہنا کم علمی ہے۔

(ط) خمخانۂ جاوید (جلد اوّل ص ۵۵) پر ایک لطیفہ درج ہے وہ بھی سن لیجیے۔

"ایک روز مکرمی منشی بہاری لال مشتاقؔ اپنے دوست لالہ رام چند قمرؔ کے ساتھ جناب مولانا ۔۔۔۔۔ (صدرالدین آزردہ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شعر و شاعری کا ذکر چلا۔ قمرؔ نے غالب ۔۔۔۔ کی بہت تعریف کی۔ مولانا نے ۔۔۔۔ فرمایا کہ نہایت مشکل کہتا ہے اور پھر زانو پر

ہاتھ مار کر شگفتہ جبیں ہوئے اور فرمایا!

"ہائے اچھا کہتا ہے تو ایسا کہتا ہے سے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے"

(۳۱)

نغمۂ اُردو المسمّٰی بہ کلّیاتِ راقم ص ۱۵۵ مطبوعہ افضل المطابع۔ دہلی

پیام یار، ماہ ستمبر ۱۸۸۸ء کے شمارے میں خواجہ قمر الدین خاں راقم دہلوی، شاگرد غالب (۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء) کی ایک چھ شعر کی طرحی غزل شائع ہوئی تھی۔ "وہ درد نہیں جس کی طبیبوں سے دوا ہو" بعد میں (۱۹۰۱ء) جب ان کا کلّیات چھپا تو اس میں اسی زمین میں ایک دوغزلہ ۲۸ شعر کا شائع ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان میں 'پیام یار' والے تمام اشعار بھی ضم کر لیے گئے ہیں۔ مگر ان میں سے تین اشعار ترمیم شدہ ہیں۔ چونکہ ان ترامیم سے راقم کے رجحانِ طبیعت کا پتا چلتا ہے اس لیے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ یہ ترمیمیں غالب کی نہیں ان کا انتقال ان اشعار کی تخلیق سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔

پیامِ یار	ایسے پہ مریں گے، ہمیں ایسا ملے کوئی	اپنی سی طبیعت ہو، ہماری سی وفا ہو
کلیاتِ راقم	مطلب کے ملے یار، نہ ایسا ملا کوئی	عادت ہو ہماری سی، ہماری سی وفا ہو
پیامِ یار	تم سے نہ کہیں حال تو پھر کس سے کہیں ہم	یا اس کو بتا دو کوئی تم سے بھی سوا ہو
	(مصرعِ اوّل بجاں)	یا اس کو بتاؤ کوئی تم سے بھی سوا ہو
پیامِ یار	مدّت ہوئی حسرت ہے کہ وہ ساماں نہیں دیکھا	دلبر ہو، شبِ ماہ ہو، صہبا ہو، صبا ہو
کلیاتِ راقم	(مصرعِ اوّل بجاں)	دلبر ہو، شبِ نور ہو، صہبا ہو، صبا ہو

پہلے اور تیسرے شعر کی ترمیم سے شعروں کے حُسن میں اضافہ ہوا ہے۔ مگر دوسرا شعر اب بھی توجہ کا محتاج ہے۔ معلوم ہوتا ہے راقم کی طبیعت میں اُپج نہ تھی۔

(۳۲)

پیامِ یار۔ لکھنؤ۔ (مختلف شمارے)

صغیر بلگرامی شاگردِ غالب کے ایک بھائی سیّد خورشید احمد تھے۔ شعر کہتے تھے تخلص کلیم تھا۔ اپنے بڑے بھائی صغیر بلگرامی سے اصلاح لیتے تھے۔ (۱۸۹۱ء میں) اسلامیہ اسکول کوہ آتھ میں ٹیچر تھے۔

"پیامِ یار" کے مندرجۂ ذیل شماروں میں ان کا کلام ملتا ہے۔ کلام اپنے استاد کی طرح شعریت سے عاری ہے۔

شمارہ فروری ۱۸۹۱ء

دیکھا ہے میں نے ان کو عجب طرح خواب میں ۔۔۔ تیوری پہ بل ہے اور ہے تلوار ڈاب میں

مانا کہ تم کو دھیان ہمارا نہیں صنم ۔۔۔ جلوہ یہ کس کا ہے دلِ خانہ خراب میں

شمارہ اپریل ۱۸۹۱ء

کب اپنے مقابل وہ سمجھتا ہے کسی کو ۔۔۔ ہوتا ہے مقابل شہِ خاور سے نکل کر

آباد ہے دم سے ترے کاشانۂ ہستی ۔۔۔ اے شوخ نہ جا تو دلِ مضطر سے نکل کر

دامن سے لہو پونچھ لے اے قاتلِ نادان ۔۔۔ ٹپکے نہ کہیں راہ میں خنجر سے نکل کر

کیونکر نہ کلیم اپنے گناہوں پہ کرے ناز ۔۔۔ بخشائیں گے حیدر صفِ محشر سے نکل کر

شمارہ فروری ۱۸۹۲ء

کب مہِ چاردہ ہو تجھ سے مقابل شبِ وصل ÷ منہ تو آئینے میں دیکھے مہ کامل اپنا

نوٹ۔ داغ کی وہ غزل جس کا یہ مقطع زبان زدِ عام ہے

"اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ ÷ ملتے امیر احمد و سیّد جلال سے"

پہلے پہل "پیامِ یار" ہی میں شائع ہوئی تھی۔ یہ جون ۱۸۹۴ء کے شمارے کے ص ۴ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

(۳۲)

دیوانِ تفتہ۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ مطبع کوہِ نور، لاہور مطبوعہ ۱۸۵۷ء

دوسرے دیوان (جسے دیوان جلد دوم لکھا ہے) پر درج ہے کہ ۱۸۵۷ء میں چھپا تھا۔ (ظاہر ہے کہ مئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے ہی چھپا ہوگا) یہ ۵۹۲ صفحات پر محیط ہے۔ آخر میں چھ صفحات قطعہائے تاریخ اور مثنوی کے ہیں۔ یہ کلام مطبع اور دیوان کے تعارف میں ہے۔ پھر آٹھ صفحے "غلط نامۂ دیوانِ تفتہ" کے لیے وقف ہیں۔

قطعۂ تاریخ ص ۲۰ کا تیسرا شعر یہ ہے ؎

سرِ پنجاہ وہشت اندر سخن شُد ☆ کنوں اُمید کاید مرگِ ناگاہ

یہاں پنجاہ وہشت سے مراد ۵۸ سال کی عمر ہے نہ کہ ۵۸ سال کی مشقِ سخن (مشقِ سخن کا حال آگے آئے گا)۔ اس لیے ۱۸۵۷ء سے ۵۸ نکالیں تو ۱۷۹۹ء ہوتے ہیں اور یہی تفتہ کا سالِ ولادت ہے۔ ۱۲۱۴ھ (جو تفتہ کا سالِ ولادت مانا جاتا ہے) ۵ رجون ۱۷۹۹ء سے شروع ہو کر ۲۴ رمئی ۱۸۰۰ء کو ختم ہوتا ہے گویا تفتہ کی ولادت ۵ رجون ۱۷۹۹ء اور ۳۱ ردسمبر ۱۷۹۹ء کے مابین ہوئی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں نہیں۔

ص۔ ۵ پر مثنوی کا یہ شعر ہے ؎

دگر کرد محنت چہل و پنج سال ۔

بہ تحصیلِ ایں، نے بہ تحصیلِ مال

تفتہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ۴۵ سال "تحصیلِ مال" میں نہیں تحصیلِ فنِ سخن میں صرف کیے۔ گویا انھوں نے (۱۸۵۷ء ـ ۴۵) ۱۸۱۲ء میں بعمر ۱۳ سال شعر کہنا شروع کیا۔ اس سے پہلے اُسی صفحے پر اسی مثنوی میں تفتہ کہہ چکے ہیں کہ "اسدؔ نام غالبؔ تخلص ہمہ/ بود مرشدِ تفتہ از بست سال ۔۔۔۔" یعنی بیس سال سے غالبؔ میرے اُستاد ہیں۔ گویا تفتہ (۱۸۵۷ء ـ ۲۰ = ۱۸۳۷ء) میں غالبؔ کی شاگردی میں آئے۔

(۳۴)

دیوانِ تفتہ ـــ مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء

جناب مالک رام لکھتے ہیں (تلامذۂ غالب دوسرا ایڈیشن۔ ص۔۱۲۰)

(۱) (تفتہ کے) دیوانِ سوم کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس کا نسخہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ البتہ تذکرۂ صبحِ گلشن اور تذکرہ روزِ روشن کا بیان ہے کہ دیوان تمام تر خلاقِ معانی کمال اسماعیل اصفہانی کی زمینوں میں ہے اور تفتہ نے ہر جگہ خوب دادِ سخن دی ہے۔

(۲) دیوانِ چہارم کا چھاپا مارچ ۱۸۶۹ء (یعنی غالب کی وفات کے ڈیڑھ دو مہینے بعد) مکمل ہوا، یہ منشی شیونارائن آرام (شاگردِ غالب) کے مطبع مفید خلائق آگرہ میں طبع ہوا تھا۔ ـــــــــــــــ "

تلامذۂ غالب میں لکھا ہے کہ بیان (۱) صبحِ گلشن ص ۸۶ ـ ۸۷ اور روزِ روشن ص ۲۳۶ ـ ۲۳۷ کے حوالے سے ہے مگر یہ دونوں تذکرے میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان میں دیوان سوم کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ کلام کے متعلق صبحِ گلشن میں لکھا ہے کہ ...... "کلامِ منظومش بسیار، پنج دیوانِ شعر دارد و ابیاتِ ہر یکے ازاں قریب سیزدہ ہزار" انتخاب کا آخری شعر ہے ؎

خوش دمِ صبح و دعا را نیز اثر ایں دم مرا
گر چشانی قطرۂ مے ساقیِ کوثر شوی

روزِ روشن میں (رامی تخلص کے تحت) لکھا ہے کہ "...... دو دواوینِ عدیدہ رشتۂ نظم کشیدہ" قطع نظر اس کے کہ صاحبِ تلامذۂ غالب کے دیے

ہوئے حوالے درست نہیں (شاید انھوں نے یہ بیان کسی اور ماخذ سے لیا ہے مگر بیان لکھنے میں سہو ہو گیا ہے) خود صبحِ گلشن کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ تفتہ کے چار دیوان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تفتہ کے دیوان تین ہیں۔ صبحِ گلشن کا مندرجہ بالا شعر "خوش دمِ صبح" الخ تفتہ کے آخری دیوان یعنی دیوانِ سوم کی آخری غزل کا ہے، نہ کہ دیوانِ چہارم کی آخری غزل کا۔ (اس دیوان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا)۔ صبحِ گلشن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہر دیوان میں تقریباً تیرہ ہزار شعر ہیں۔ یہ تعداد اشعار اس حد تک صحیح ہے کہ تفتہ کا ہر دیوان ضخیم ہے اور یقیناً ان میں ہزارہا اشعار ہیں۔ صحیح تعداد شمار کرنے پر ہی متعین ہو سکتی ہے۔ تفتہ کے تین دیوانوں میں سے میرے غالب کلیکشن میں دو دیوان ہیں، دیوانِ دوم مطبوعہ ۱۸۵۷ء اور دیوانِ سوم مطبوعہ ۱۸۶۹ء۔ صاحبِ تلامذۂ غالب کا بیان (۲) دیوان سوم ہی سے متعلق ہے۔ دیوانِ سوم کی آخری عبارت یہ ہے۔

"الحمد للہ کہ ایں نسخۂ عجیب دیوانِ تفتہ بحُسنِ سعی و کار پردازیِ کارپردازانِ مطبع بماہ مارچ ۱۸۶۹ء حلیۂ اختتام یافت"

کہا گیا ہے کہ اس دیوان کے شروع کے صفحات غائب ہیں اگر ایسا تھا تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ یہ دیوانِ چہارم ہے۔ البتہ اس کے دیوانِ سوم ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ مثلاً دیوان کے ص ۶۲۲ پر یہ مقطع ہے سہ

تفتہ تو صاحبِ سہ دیوانی[1] — تا بدیوانِ حشر اجرِ تو چیست

اس سے ظاہر ہے کہ تفتہ کے تین دیوان اس غزل کی تخلیق تک مکمل ہو چکے تھے۔

---

[1] تفتہ کے دیوانِ غزلیات کے بارے میں صحیح تعداد نساخ نے درج کی ہے۔ کہتے ہیں۔ "تفتہ تین دیوان کے مصنف ہیں، ان کے دو دیوان نظر سے گزرے" (تذکرہ المعاصرین از نساخ مشمولہ سفینہ، پٹنہ بابت جنوری تا اپریل ۱۹۸۷ء) یہ تذکرہ کم از کم ۱۸۸۱ - ۱۸۸۰ء میں لکھا جانا شروع ہوا تھا۔

دیوان کا آخری شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

تفتہ دیوانِ قضا را چوں نہ سر دفتر شوی
گر کنی دیوانِ چہارم ہم بدیں خوبی تمام

یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ دیوان سوم بخیر و خوبی تمام ہو گیا ہے۔ اب تفتہ کی تمنا ہے کہ دیوانِ چہارم بھی اس خوبی سے تمام ہو جائے۔ تفتہ کے دیوانِ سوم "دیوانِ تلمیذِ غالب" کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۸۶۹ء سالِ عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ کل صفحات ۶۴۶ ہیں، جن میں متن کو ۶۴۲ صفحے اور "غلط نامہ دیوانِ تفتہ" کے چار صفحے شامل ہیں، مگر سرورق اور دیباچے کے چار صفحے شامل نہیں۔ انھیں بھی شمار کر لیں تو ۶۵۰ صفحات ہوتے ہیں۔ دیباچہ وہی ہے جو غالبؔ نے دیوانِ اوّل کے لیے لکھا تھا اور جو پنج آہنگ میں بھی شامل ہے۔ وہی تبرک کے طور پر "بر سوم دیوانِ تفتہ" ثبت کر دیا گیا ہے۔ حاشیے میں نوٹ ہے۔

" ہفتہ مبارکہ ایں نقشِ ثالث است نہ ثانی و نقشِ ثانی در مطبع کوہِ نور لاہور مطبوعہ شد—" متن کا ہر صفحہ ۲۵ سطری ہے مگر اشعار بیشتر ۲۳ فی صفحہ ہیں، کہیں کہیں ۲۴ بھی ہیں اور خال خال ۲۲ اشعار فی صفحہ سے کم بھی ہیں۔ اس طرح اگر ۲۲ اشعار فی صفحہ اوسط مان لیں تو ۶۴۲ صفحات پر ۱۴۱۲۴ شعر ہوئے۔ اس طرح دیوانِ سوم میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ ۱۴۰۰۰ شعر درج ہیں۔

تمام غزلیں جلال اسیرؔ کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔ حاشیے میں اسیرؔ کا مطلع درج ہے اور متن میں اسی زمین میں تفتہ کا دو غزلہ اور سہ غزلہ اور کہیں چار غزلہ ہے۔ بہت سے مقطعوں میں اپنے تخلص کے ساتھ اسیرؔ کا تخلص بھی دیا ہے۔ اور اس کے مطلع کے ایک مصرعے کو تضمین کر لیا ہے۔ جیسے ؎

خوش یافت تفتہ ایں ثمر زود در پس اسیر
"چوں دیر شد بہار ثمر زود می رسد"

مصرعِ ثانی اسیرؔ کے مطلعے کا مصرعِ ثانی ہے۔

(۳۵)

قطعۂ تاریخ طبع مثنوی مولوی معنوی۔ از منشی ہرگوپال تفتہ

دیوانِ سوم مارچ ۱۸۶۹ء میں چھپا جو ۱۲۸۵ھ کے آخری مہینوں کے مطابق ہے مگر تفتہ نے مثنوی مولوی معنوی ۱۲۸۲ھ کے لیے، ایک قطعہ تاریخ کہا تھا جو دیوانِ سوم میں درج نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دیوانِ سوم صرف مجموعۂ غزلیات ہے۔ یہ قطعہ میرے کتب خانے کے مثنوی مولوی معنوی کے ایک نسخے (مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۴ء) میں درج ہے۔ اب یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

"نتیجۂ فکر شاعرِ پختہ کلام، ادرج سخن را ماہِ دو ہفتہ
منشی ہرگوپال تخلص بہ تفتہ تلمیذِ رشید مولانا غالب

طبع شد آں نسخہ کو راہنما شد مرا	دیدنِ آں شد دگر کام روائے دلم
از سبب آں کہ ایں ہمہ دولت نصیب	در حق او ہر زبان باد دعائے دلم
آئنہ از فیضِ او شد ہمہ تن گویا	دید تواں ایں زماں صدق صفائے دلم
الغرضش سالِ طبع تفتہ ہمیں زد رقم	مثنویِ مولوی عقدہ کشائے دلم

۱۲۸۲ھ

(استدراک)

(۱) آغا سرخوش قزلباش آج کل یکم جولائی ۱۹۴۳ء کے شمارے (ص ۲۱) میں لکھتے ہیں

"تفتہ کا ایک فارسی دیوان اس وقت زیرِ نظر ہے۔ جس کا نام "دیوانِ تلمیذِ غالب" ہے۔ جس سے ۱۸۶۹ء نکلتا ہے۔ یہ دیوان پہلی بار چھپا تو اس پر غالب نے

خود دیباچہ لکھا۔ دوسری بار دیوان مطبع کوہِ نور لاہور میں چھپا۔ بار سوم منشی شیو نرائن صاحب نے مطبع مفیدِ خلائق آگرہ سے شائع کیا۔ اس نسخے میں مہتمم صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ دیباچہ غالب نے دیوان کی پہلی اشاعت میں لکھا تھا، لیکن اس نسخے میں وہی تبرگا درج ہے ۔۔۔۔۔" یہ بیان آغا صاحب کی کم آگہی پر دلالت کرتا ہے۔ غالب کا دیباچہ تفتہ کے دیوانِ اول (پہلے دیوان) کے لیے لکھا گیا تھا۔ دوسرے دیوان میں اسے شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ تیسرے دیوان میں تبرگا شامل کر لیا گیا تھا۔ اوپر بیان کیے گئے تین الگ الگ دیوان ہیں۔ ایک ہی دیوان کے تین ایڈیشن نہیں، اگرچہ نقشِ اول، نقشِ دوم، نقش سوم (جیساکہ دیوانِ سوم کے حاشیے میں مرقوم ہے) سے یہی التباس ہوتا ہے کہ ایک ہی دیوان کے تین ایڈیشن ہیں۔

(۲) تذکرۂ صبحِ گلشن میں لکھا ہے کہ تفتہ کے پانچ دیوان ہیں۔ چونکہ تذکرے میں تفتہ کی مثنویوں کا ذکر نہیں۔ اس لیے قوی گمان ہے کہ یہاں پانچ دیوان سے مراد قصیدے اور غزلیات وغیرہ کے تین دیوان اور دو دیوان مثنوی سنبلستان اور مثنوی تضمینِ گلستاں (یا سعدی کی کریما کی تضمینیں) ہیں۔

(۳۶)

خمخانۂ جاوید۔ جلد اوّل، ص ۲۵۳

"سیف الحق (ادیب) ۱۸۴۶ء میں بمقام دہلی محلہ مفتی صاحب پیدا ہوئے ۔۔۔۔۔ لڑکپن ہی میں قابلِ امتثال لیاقت حاصل کرلی ۔۔۔۔۔

شروع میں مرزا یوسف علی خاں عزیز شاگردِ غالب سے تلمذ اختیار کیا اور کئی برس تک ان کی روش پر کہتے رہے۔ ایک دفعہ کسی مشاعرے میں غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے
پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

سُنا ہے مرزا غالب بھی موجود تھے۔ پاس بلا کر پیار کیا اور فرمایا کہ "میاں سیفو! ہمارے پاس آیا کرو آج سے ہم تمہیں بتائیں گے۔۔۔۔۔۔۔"

اس کے برعکس تلامذۂ غالب (بار دوم۔ مئی ۱۹۸۴ء ص ۳۹) میں لکھا ہے۔ "اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کلام کی اُپج دیکھ کر مرزا نے فرمایا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مرزا غالب کے بعد چندے مرزا یوسف علی خاں عزیز (اور شاید قربان علی بیگ) سے بھی مشورہ کیا۔۔۔۔"

کلام کا انتخاب دیتے ہوئے صاحب تلامذۂ غالب نے مندرجہ بالا شعر تو درج کیا ہے مگر خمخانۂ جاوید والی حکایت درج نہیں کی۔ خمخانۂ جاوید (جلد اوّل ص ۲۵۵) میں ایک اور واقعہ بھی درج ہے۔ لکھا ہے۔

"نوک جھونک کی عادت ایسی تھی کہ کسی سے نہ چوکتے تھے ۔۔۔۔۔۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے مولوی عبدالرحمٰن راسخ ساکن بنت نے غالب کی طرز میں غزل لکھی جس کے مقطع میں غالب مرحوم پر منھ آ گئے ؎

کہیں چھپ چھپ کے سُنے پیتے ہیں شاید حضرتِ راسخ
ترے اشعار بھی غالب کی ٹکّر ہوتے جاتے ہیں

پھر کیا تھا۔ ادیب نے میاں ملنگ سبزی فروش سے اسی زمین میں غزل پڑھوائی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

عجب جھم جھم کا مضموں ہے کہ ہیں لیس اپنے دعوے میں
بنت والے بھی اب غالب کی ٹکّر ہوتے جاتے ہیں"

(۳۷)

گفتارِ بےخود - بیخود دھلوی، مطبوعہ جنوری ۱۹۲۸ء بارِ دوم

گفتارِ بیخود پہلی بار شاید ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی - یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔
اقتباسات اسی دوسرے ایڈیشن سے ہیں :

(۱) ص ۲۲ آپ (بیخود دہلوی جانشینِ داغ) کے والد کا نام سیّد شمس الدین احمد عرف سیّد احمد متخلّص بہ سالم تھا۔ دادا کا نام سیّد بدرالدین احمد تخلّص سالک و کاشف تھا (جو) مرزا غالب مرحوم کے شاگرد تھے - پردادا امتیاز الدولہ افتخار الملک نواب احمد میر خاں بہادر، منصور جنگ، عالمگیر ثانی کے وزیر تھے .... اور مفتی صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور، آزردہ تخلّص، آپ (بےخود) کی والدہ کے پھوپھا تھے ....
... خواجہ الطاف حسین صاحب حالی .... سے
(بیخود نے) مہر نیمروز اور دواوینِ استادِ فارسی پڑھے
..... آخر مولانا حالی کی تحریک سے آپ کے ماموں مولوی عبدالرحیم صاحب بیدل دہلوی آپ کو داغ مرحوم کی خدمت میں لے گئے ...."

ص ۲۳ "قدرت نے بیخود کو سخن گوئی کے ساتھ سخن فہمی کا مادّہ بھی عطا فرمایا ہے چنانچہ شرحِ دیوانِ غالب لکھ کر اردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے - اس شرح نے گذشتہ تمام شرحوں پر پانی پھیر دیا ہے ...."

(۲) ص ۲۶ " غالب مرحوم نے جب مشکل کلام کہا تو وہ مقبول نہ ہوا۔ جب ٹکسالی زبان میں کہنے لگے، مقبولیت نے انھیں سر پہ

رکھا، آنکھوں سے لگایا...... وہ لوگ جو اہلِ زبان نہیں ہیں،
زبان پر دسترس نہ پا کر غالبؔ کا تتبع اختیار کرتے ہیں...
اور بزعم خود سمجھ لیتے ہیں کہ فرمودۂ غالبؔ کی پوری ریس ہو گئی۔
بہرحال یہ چیز اکتسابی ہے اس کا حاصل ہونا دشوار نہیں،
لیکن اہلِ زبان ہونا اپنے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ایسی
ماں کی گود چاہیے جو اہلِ زبان ہو.......''

(۳) ص ۲۷ ''ابتدا میں غالبؔ مرحوم عام فہم اشعار کو طنز کے طور
پر ''جامیانہ'' کہتے تھے۔ مراد یہ تھی کہ جس طرح حضرت مولانا
جامیؔ علیہ الرحمہ کا کلام سیدھا سادھا اور ہیر پھیر کی باتوں سے
مبرا ہوتا تھا اس طرح یہ سادہ اشعار بھی ہیں اس لیے ''جامیانہ''
ہیں لیکن غالبؔ کو کیا معلوم تھا کہ ایک روز انھیں بھی ''جامیانہ'' روش
اختیار کرنی پڑے گی.......

(۴) ؎ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
غالبؔ کی اس مشہور غزل پر بیخودؔ کی غزل سے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

ص ۲ عشق کی نیرنگیاں آخر نمایاں ہو گئیں — آپ کی زلفیں مرا حالِ پریشاں ہو گئیں
مسجدوں میں اہلِ دل ہم کو نظر آتے نہیں — کیا یہ محرابیں بھی یارب طاقِ نسیاں ہو گئیں
یہ عروجِ حُسن تھا یا انقلابِ آسماں — مصر کی گلیاں تجلّی گاہِ کنعاں ہو گئیں
اے فلک! وہ نامرادِ آرزوئیں کیا تو ہوں — جس کی امیدوں کی صبحیں شامِ ہجراں ہو گئیں
عشق کی تکمیل بھی اک معجزہ ہے عشق کا — ہجر کی بے چینیاں سب راحتِ جاں ہو گئیں
خندہ بے تمہید گر یہ، عشق ہے غم کی دلیل — باغ میں کلیاں کھلیں، کھِل کر پریشاں ہو گئیں
دونوں عالم میں نہ تھا عشق و محبت سا ادیب — خلد کی حوریں مری صحبت میں انساں ہو گئیں
حضرتِ غالبؔ کا مصرع ورد لب بیخودؔ کے ہے — ''خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں''

اب مندرجہ بالا پر کچھ اظہارِ رائے کیا جاتا ہے

(۱) چونکہ دیباچہ گفتارِ بیخودؔ خود جنابِ بیخودؔ مرحوم کی دیکھ ریکھ میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے بیخودؔ کے[1] دادا جنابِ سالکؔ و کاشفؔ مرحوم کو غالبؔ کا شاگرد قرار دینے کے لیے یہی اولین ماخذ سمجھا جائے گا۔

مَیں نے جنابِ بیخودؔ مرحوم کی شرحِ دیوانِ غالبؔ کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے پہلے دو ایڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ معمولی ترمیم و اضافہ کے علاوہ اس شرح اور دوسری شرحوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔

(۲) اہلِ زبان اور زبان داں میں روزمرہ اور محاورہ کی حد تک کی بحث اہلِ زبان کو یقیناً فوقیت حاصل رہے گی مگر جہاں تک اردو کا تعلق ہے اب اس کا کوئی مرکز نہیں رہ گیا ہے جس کی پیروی کی جا سکے۔ اساتذہ سے بغاوت بھی اب فیشن بن چکی ہے۔ میری رائے میں زبان و بیان کی حد تک اساتذہ سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

(۳) یہ بات کہ عام فہم اشعار کو غالبؔ طنز سے "جامیانہ" اشعار (یعنی مولانا جامی کی طرح کے سادہ) کہا کرتے تھے، کہیں اور نظر سے نہیں گزری۔ جنابِ بیخودؔ، غالبؔ کے انتقال کے وقت چھ سال کے تھے۔ اگر انھوں نے بچپن میں کسی سے سُنی ہو تو عجب نہیں۔

(۴) خدا معلوم بیخودؔ صاحب نے حینِ حیات ثاقبؔ لکھنوی کو کس بنا پر "یادگارِ غالب" کہا گیا ہے؟

(۵) جنابِ بیخودؔ اپنے وقت کے جیّد استاد اور شاعر تھے جیسا کہ

---

[1] ایک مقطع میں بیخودؔ نے اپنے دادا کا ذکر کیا ہے اور انھیں اپنا رہنما بتایا ہے کیونکہ وہی بیخودؔ کے خاندان میں پہلے شاعر تھے ؎

کاشفؔ کی رہنمائی ضرب المثل ہوئی ہے   بیخودؔ کو دکھایا مجھو جمال تیرا

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا، انھوں نے یہ غزل بھی خوب کہی ہے۔ اگرچہ غالبؔ کی اس نہایت کامیاب غزل پر غزل کہنا آسان بات نہ تھی تاہم انھوں نے کہی اور خوب کہی۔ ان کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

زباں استاد کی بیخودؔ تو ہو مضمون مومنؔ کا
بیاں غالبؔ کا ہو، اشعار کی یہ شان پیدا کر

یہ محض تعلّی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہاں اُستاد سے مُراد ذوقؔ اور داغؔ ہے۔ داغؔ کا رنگ تو ان کے یہاں ہے ہی مگر مومنؔ کا اسلوب بھی خوب جھلکتا ہے اور کہیں کہیں غالبؔ کا بھی۔ جہاں وہ کہتے ہیں ؎

ڈوبے رات کے تشریف وہ لائے ہیں یہاں
منھ اندھیرے یہ تقاضا ہے کہ گھر جاتے ہیں

وہیں ایسے شعر بھی ان کے قلم سے نکل گئے ہیں ؎

اے اجل! تُو تو بُرے وقت میں کام آتی ہے
پھر یہ کیوں لوگ ترے نام سے ڈر جاتے ہیں

بے وفا میری طبیعت پہ نہ ہو تو نازاں
دل میں اُترے ہوئے بھی دل سے اُتر جاتے ہیں

میرے عاشق نہ بنو تم! مرے معشوق رہو
لطف بھی جَور میں جب حد سے گزر جاتے ہیں

دیکھ لے بحرِ شہادت کے شناور ہم ہیں
خون میں ڈوبے ہوئے تا بہ کمر جاتے ہیں

بادۂ عشق کی تاثیر یہ دیکھی بے خود
خشک ہوتا ہے لہو، ہوش بکھر جاتے ہیں

---

(۳۸)

تذکرہ آثار الشعرائے ہنود (تذکرۃ الشعرائے ہنود) دیبی پرشاد بشاش
جنوری ۱۸۸۸ء

ضمیمہ ص ۱۵ مونس تخلص، شیو جی رام، قوم برہمن، سکنہ دہلی، شاگرد (مرزا غالب صاحب دیوان۔)

(تین شعر)

تذکرہ ہندو شعرا، موسوم بہ بہارِ سخن میں، برق سیتاپوری مرحوم نے یہی تین شعر اور ذرا سے لفظی الٹ پھیر کے ساتھ، یہی نثر درج کردی ہے۔ صاحب "تلامذۂ غالب" نے نہ جانے بشاش کے تذکرے آثار الشعرائے ہنود پر بہارِ سخن کو ترجیح کیوں دی تاہم "تلامذۂ غالب" میں اہم اضافے ملتے ہیں۔ پہلا یہ کہ مونس کا دیوان مختصر تھا اور وہ گیان پریس دہلی میں ۱۸۸۱ء میں چھپا تھا۔ دوسرا یہ کہ انتخاب کلام میں دوسرے تذکروں سے ۱۳ اشعار زیادہ ہیں لیکن حوالوں میں دیوانِ مونس کا ذکر نہیں کیا۔ جناب مالک رام نے مونس کا دیوان نہیں دیکھا تھا؟ پھر یہ اطلاعات اور اشعار انھوں نے کہاں سے لیے۔

درگا پرشاد نادر دہلوی تلمیذ امام بخش صہبائی نے اپنی کتاب کنز تاریخی (ص ۸۱) میں ایک دائرے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " یہ دائرہ پنڈت شیو جی رام صاحب برہمن دہلوی متخلص بہ مونس شاگرد جناب مرزا نوشہ صاحب غالب مرحوم کے دیوان پر چھپ گیا ہے مگر وہاں، دائرہ خورد کا فقرہ نہیں لکھا تھا۔ یہ اب زیادہ کر دیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ " دائرے کے دو حصّے ہیں۔ باہری حصّے (دائرہ کلاں)

میں صرف اعداد دیے ہیں جس سے دو مرتبہ ۱۸۸۱ء کے عدد نکلتے ہیں مگر الفاظ یا مصرع نہیں دیے گئے جو ظاہر ہے دیوان میں شامل ہوں گے۔ مگر اندرونی حلقے (دائرہ خورد) میں ۱۲۹۸ھ کا سنہ "مایۂ دانش ترکیبِ نادر" سے برآمد کیا ہے اور یہ فقرہ بقول نادر دیوانِ مونس میں چھپنے سے رہ گیا ہے۔

(۳۹)

کنزِ تاریخی از درگا پرشاد نادر دہلوی، مطبوعہ حسینی پریس دہلی ۱۸۹۲ء

ص ۳۲ "نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلّص بہ اسدو غالب، معروف بہ مرزا نوشہ صاحب مرحوم دہلوی المسکن اکبر آباد المولد کی تاریخ وفات ۱۸۶۷ء (سہو کاتب ۱۸۶۹ء ہونا چاہیے)

اسد اللہ خاں بہادر ہا

چوں اجل پیشِ حق تعالیٰ بُرد | گفت نادر خود از سرِ افسوس

۱۸۶۸ء

غالبِ بے مثال آہ بہ مُرد

نکتہ ۔ جن صاحبوں نے غالب علی کل غالب کی قاطع برہان اور اس کے جواب و ردِ جواب ملاحظہ فرمائے ہوں گے، وہی اس تاریخ میں 'افسوس' کے لفظ کا حظ اٹھائیں گے ــــــــ"

اس تاریخی مادے میں نکتہ یہ ہے کہ جب تک افسوس کا الف مادے میں شامل نہ کیا جائے گا تاریخ درست نہ ہوگی۔ اور اگر افسوس کا الف گرا دیا جائے تو فسوس رہ جاتا ہے۔ اب غالب نے قاطع برہان میں افسوس اور فسوس کی بحث اٹھائی تھی اور کہا تھا کہ افسوس اور فسوس دونوں ہم معنی نہیں اور کہ افسوس عربی لغت ہے اور فسوس فارسی۔ مگر ان دونوں دعووں میں انھوں نے منہ کی کھائی۔

فرہنگِ معین میں جو تازہ اور معتبر فرہنگ ہے۔ فسوسیدن اور افسوسیدن دونوں،

مصدر ایک ہی لغت کے تحت موجود ہیں اور افسوس اور فسوس کو ہم معنی قرار دیا ہے۔

ص ۳۳ "تاثیر القلوب منشی حبیب الدین سوزاں کی تاریخ ۱۲۸۸ھ

(۱) چھپا جب فنِ شعر میں یہ رسالہ (۲) کہ جس کے سبب رازِ غیبی کھلا ہے

(۳) وہیں بے سرِ اندیشہ تاریخ نادر (۴) کہی عقل نے رازِ غیبی کھلا اب"

یعنی ۱۲۸۹-۱ = ۱۲۸۸ھ

حبیب الدین احمد انصاری سوزاں سہارنپوری شاگردِ غالب کی ولادت ۱۸۲۴ء میں اور وفات ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں یہ قطعۂ تاریخ کتاب میں شامل کیا گیا تھا کہ نہیں۔

ص ۳۴ "ہنجارِ سالک یعنی مرزا قربان علی بیگ صاحب سالک کے دیوان فیض تبیان کے اوّل دفعہ چھپنے کی تاریخ، بصنعت اطراد یعنی اس میں ...... شاعروں کا سلسلۂ شاگردی ولی دکن کے یہاں تک پشت بہ پشت برابر دکھایا گیا ہے ؎

کس کو ہمیشگی ہے جہانِ خراب میں
سب کو فنا ہے، ذاتِ الٰہی کو ہے بقا

زندہ ولی[۱] و قائم[۲] و سودا[۳] کہاں ہیں اب
ان کا پتا نہیں سخنِ نغز کے سوا

چھوڑا نہ ایک کو بھی اجل نے دریغ یاں
حاتم[۴] رہا نہ مائل[۵] شیریں سخن رہا

نے حضرتِ نصیر[۶] نہ غالب رہے دریغ
یہ کیا ہوا کہ ہو گئے یکبار سب فنا

جس دم کہ چل بسے یہ سخن سنج دہر سے
باغِ سخن کا رنگ ہوں کچھ اور دیکھتا

دیکھا چمن چمن کو، بہت کر چکا تلاش
پایا نہ بوستانِ جہاں میں سخن سرا

البتہ ایک حضرتِ سالک کی نظم میں
آتا ہے کچھ اساتذہ کی طرز کا مزا

نادر[۹] مجھے کلام کی تھی ان کے جستجو
ہے لاکھ لاکھ شکر کہ دیوان چھپ گیا

حسنِ قبول کیوں نکے نہ پائے جہان میں
اعجاز ہے کلام میں مضمون ہے نیا

شاگردِ خاص حضرتِ غالب کے ہیں مگر
کیوں نظم روح بخش نہ ہو نشرجا نفزا

تاریخ طبع سے مرے ہر اک کو رشک ہے
سالک وہ انتخاب یہ دیوان ہے چھپا

میرے کتب خانے میں ہنجارِ سالک کا جو نسخہ ہے اس کے آخری چند اوراق نہیں ہیں۔ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ یہ قطعہ دیوان کی زینت ہے یا نہیں۔

مرزا قربان علی بیگ خاں (قربان) سالک حیدر آبادی ثم دہلوی، شاگردِ غالب، ولادت ۱۲۴۰ھ (۲۵-۱۸۲۴ء) اور وفات ۱۲۹۷ھ (۸۰-۱۸۷۹ء) میں ہوئی تھی۔ غالب کے انتقال کے بعد ان کے بہت سے نومشق شاگردوں نے سالک ہی سے اصلاح لی تھی۔ اس طرح نادر کا یہ کہنا غلط نہیں کہ سالک کے اشعار میں اساتذہ کی طرز کا مزا آتا ہے۔

(۴۰)

تلامذۂ غالب از مالک رام - بارِ دوم - مئی ۱۹۸۴ء

(ص ۲۲۶)۔ رند — جانی بانکے لال

غالب کے اپنے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار بھرت پور میں وکیل تھے اور ان ہی کے واسطے سے ...... تفتہ کو بھی وہاں کس طرح ملازمت مل گئی تھی یا کوئی اور سلسلہ روزگار ہو گیا تھا۔ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵-۱۸۵۶ء) میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک طویل مرثیہ تفتہ کے دیوانِ دوم .... میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور پچاس برس کی عمر میں لاولد فوت ہوئے ...."

جانی بانکے لال رند کے بارے میں تفصیلات بہت کم ملتی ہیں۔ اس لیے جناب مالک رام نے بھی اردوے معلّٰی کے علاوہ صرف اس مرثیے پر تکیہ کیا ہے جو تفتہ کے دیوانِ دوم میں شامل ہے۔ یہ مرثیہ تفتہ کے دیوان کے ص ۵۳۱ پر اس عنوان کے تحت درج ہے

"نوحہ در انتقالِ جانی بانکے لال رندؔ تخلص وکیل راجۂ بھرت پور"

اس مرثیے کے ۷۱ شعر ہیں۔ مرثیے پر نظر ڈالنے سے پہلے ذیل کے دو اقتباسات دیکھ لینے چاہئیں۔ یہ اقتباس "دہلی اردو اخبار" شائع کردہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی - ۱۹۷۲ء سے لیے گئے ہیں۔

(ص ۳۱۷) "واضح ہوتا ہے کہ ان دنوں بابو جانی بانکے لال کے تئیں جو کہ نمک خوارانِ قدیم سرکار بھرت پور ہے اور مردِ ذی لیاقت ہے، خلعت وغیرہ (بھرت پور میں) عنایت کیا اور موضع چنا کہ قدیم سے بیچ جاگیر بزرگوں ۔۔۔۔۔ بابوے مذکورہ (جانی بانکے لال) کے تھا اور چند مدّت سے سرکار میں قُرق ہو گیا تھا پھر سند اس کی بابوے مذکور کو مرحمت کی اور پالکی اور گھوڑا وغیرہ سامانِ سفر عنایت کر کے بتقریب سفارت دربار لفٹنٹ گورنر جنرل بہادر میں رخصت فرمایا ۔۔۔۔۔۔۔۔" (۵ اکتوبر ۱۸۴۰ء)

(ص - ۳۵۰) اکیسویں تاریخ دسمبر محرّم شنبہ کو جناب لیفٹنٹ گورنر جنرل بہادر نے دربار میں اجلاس فرمایا ۔۔۔۔۔ بابو جی جانی بانکے لال وکیل سرکار بھرت پور نے ۱۸ تاریخ نومبر کو مسٹر طامس ۔۔۔۔۔۔ سکریٹری صاحب ۔۔۔۔ سے ملازمت حاصل کی اور ۲۹ تاریخ کو مسٹر ہملٹن ۔۔۔۔۔ کمشنر آگرہ سے ملاقی ہوئے ۔۔۔۔۔ جب روبرو پہنچے تو صاحبِ موصوف بمقتضائے پاسِ عزتِ مہاراجہ (بھرت پور) تعظیم کو اٹھے۔ بابو مذکور نے چند اشرفیاں نذر گزرانیں۔ صاحبِ موصوف نے ۔۔۔۔۔۔ کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی ۔۔۔۔۔۔"

(۱۳ دسمبر ۱۸۴۰ء)

جانی بانکے لال نے پچاس سال کی عمر پائی۔ اگر یہ سال عیسوی ہیں تو گویا ولادت ۱۸۰۶ء میں

ہوئی اگر ہجری ہیں تو ولادت (۱۲۲۲ھ) ۱۸۰۷ء میں قرار پاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بابو جانی بانکے لال ۳۴-۳۵ سال ہی کی عمر میں اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے بھرت پور راج کے سفیر مقرر ہو گئے تھے۔ ان اقتباسات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جانی عالی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور زمانۂ قدیم سے کم از کم ایک موضع چمنا ان کی خاندانی جاگیر میں شامل تھا۔

غالب کی ملاقات جانی صاحب سے ۱۸۵۱ء میں مرزا کے ایک انگریز دوست جان جوزف کے ہاں ہوئی تھی۔ آگے چل کر تعلقات بہت استوار ہو گئے تھے۔ اشعار بھی اصلاح کے لیے آنے جانے لگے تھے۔ غالب، مہر نیمروز کے مسودے کی ایک نقل جانی جی کو بھی بھجوایا کرتے تھے۔ مرزا نے ایک خط میں جو ۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو بدرالدین احمد فقیر و کاشف کو جو بھرت پور ہی میں ملازم تھے، لکھا ہے

"بابو صاحب (جانی بانکے لال) کے واسطے میرا دل بہت جلا، زمانہ ان دنوں ---- میں ان سے بر سرِ امتحان ہے ----
علاقہ مساعدت روزگار کی وہ صورت، شدائدِ رنج و سفر کی وہ حالت، ناسازیِ مزاج کا وہ رنگ، ان سب باتوں کے علاوہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ جوان داماد مر جاوے اور بیٹی بیوہ ہو جاوے ------- جب وہ بھرت پور آجائیں تو آپ ان کے آنے کی مجھ کو اطلاع دیجیے گا -------"

ظاہر ہے اس ناسازیِ حالات و مزاج اور اوپر سے جوان داماد کی موت ان کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئے اور بابو جانی بانکے لال رند ۱۲۷۲ھ میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۵ء تا یکم ستمبر ۱۸۵۶ء کسی وقت وفات پا گئے۔ تفتہ نے ۱۲۷ اشعار کا دلدوز مرثیہ لکھ کر جانی جی کے احسانات کی قیمت چکائی اور یہ تاریخ نکالی ؎

مُردنِ رندِ زد بجاں زخمے = ۱۲۷۲ھ

تفتہ جانی جی کی بہت عزت کرتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں ؎

باعثِ فخرِ ہند بانکے لال
متخلص بہ رند۔ بانکے لال

شانِ مغفور عظمتِ قیصر — شوکتِ جم، شکوہ دارا داشت
باطن آئینہ دارِ ظاہر او — خوئے نیکوئے روئے زیبا داشت
ہمہ شے داشت لیک رزّقِ حوال — بود آں شہ کہ او نہ اصلا داشت

اُنھیں اپنا مشفق مہربان مانتے تھے ؎

لطف مے کرد و مرحمت مے کرد — مشفقم بود و مہربانم بود !!

تفتہ نے بتایا کہ جانی جی نے پچاس سال کی عمر پائی ؎

چہ ہما بود آنکہ پنجہ سال — ماند ایں جا بدام و رجت آخر

معلوم ہوتا ہے موت حرکتِ قلب بند ہونے سے اچانک ہوئی اور دمِ نزع زبان بند ہو گئی تھی۔

ناگہاں ساقیِ اجل را یافت — ناگہاں جُرعۂ ممات چشید

ایں چُنینی کہ جانِ جاناں بود — ترکِ زفرمود ناگہاں جاں را
تا چرا گشت بے زباں دمِ نزع — نتواں گفت رازِ پنہاں را
مُرد، حرفے نہ گفت، وا شوقا — رفت ہمچو یم ندید وا ویلا

تفتہ اس مرثیے میں لکھتے ہیں ؎

تا ازیں خانداں چہ مے پُرسی — فخر ایں خانداں کہ بود نہ ماند
بہ درِ او ہمیں پسر مے داشت — درجہاں نام و نشاں کہ بود نہ ماند

ان دو شعروں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جانی بانکے لال رند اپنے خاندان کی آخری نشانی تھے اور ان کے ساتھ نسل ختم ہو گئی۔ اس سے جناب مالک رام نے اندازہ لگایا کہ وہ لاولد فوت ہوئے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کم از کم ایک لڑکی (جو بیوہ ہو گئی تھی) چھوڑ کر مرے۔ "(وہ) لاولد فوت ہوئے" کی جگہ انھوں نے کوئی اولادِ نرینہ نہیں چھوڑی" کہنا چاہیے تھا۔ اگرچہ بات وہی رہتی کیونکہ بیوہ لڑکی ابھی جوان تھی اور شاید اس کے ابھی کوئی اولاد بھی نہ تھی اور اس زمانے میں ہندوؤں میں بیوہ کی شادی نہیں ہوتی تھی۔ گویا بیوہ لڑکی کے مرنے پر جانی جی کے خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔

(۴۱)

دودِ چراغِ محفل ۔ حسام الدین راشدی ۔ مارچ ۱۹۶۹ء ۔ ص ۱۵۴

"ایک مرتبہ حضرتِ باقرؔ[1] کے ساتھ کسی شخص نے غالبؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی غالبؔ — پاس میخانہ ہے پی کر کے ابھی آتے ہیں

باقرؔ کو شک پڑا اور دیر تک سوچتے رہے۔ آخر اسی روز غالبؔ کو خط لکھ کر ... استفسار کیا۔ غالبؔ نے جواب میں یہ لکھا ہے "اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ایک ہزار لعنت ۔ ورنہ جس نے اس کو یہ غلط میری جانب منسوب کیا ہے، اس پر دس ہزار لعنت۔ مجھے کیا شامت آئی تھی کہ پاس میخانہ ہوتے ہوئے مجلسِ وعظ میں جا کر بیٹھتا۔"

یہ شعر یقیناً غالبؔ کا نہیں کیونکہ قائمؔ کا[2] ہے ۔ لوگ اکثر دوسروں کے معمولی شعر غالبؔ سے منسوب کر کے سنایا کرتے تھے ۔ جس پر وہ بگڑ کر لعنت ملامت کیا کرتے تھے ۔ اپنے شاگرد شیو نرائن آرام کو اپنے خط مورخہ چہار شنبہ (۲۶) ۲۷ را پریل ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں ۔

" حاشا ثم حاشا ، اگر یہ غزل میری ہو یا اسد اور لینے کے دینے پڑے ، اس غریب کو میں کیوں کہوں ؟ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت ۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا قبلہ آپ نے کیا خوب

---

[1] شاہ باقر علی باقرؔ شاگردِ غالب ۔ ولادت ۱۹ رجون ۱۸۳۱ء ۔ وفات ۲۴ رجولائی ۱۹۰۸ء ۔ یہ اقتباس دیوانِ باقرؔ کے مقدمے سے ماخوذ ہے ۔

[2] اصل شعر یوں ہے ؎ مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائمؔ — یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

مطلع کہا ہے ؎

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

میں نے یہی ان سے کہا کہ اگر یہ مقطع میرا ہو تو مجھ پر لعنت .... میرا کلام اور ایسا زدف .... " طرز تحریر سے یہ خط جو مرتبہ مقدمۂ دیوانِ سیّد عطا حسین، خلف باقرؔ شاگردِ غالبؔ درج کیا ہے، غالبؔ ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر اسے لفظ بہ لفظ گفتۂ غالبؔ یا نگاشتۂ غالبؔ مان لیا جائے تو غالبؔ کے اردو خطوط میں ایک اور خط کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ جزوی طور پر ہی سہی۔

(۴۲)

تذکرۃ المعاصرین (خصوصی شمارہ سفینہ، پٹنہ۔ ترجمہ و ترتیب عطا کاکوی بابت جنوری، اپریل ۱۹۸۷ء) مؤلف: عبدالغفور نساخ

ص ۲۱ خواجہ غلام غوث بے خبر کشمیری کے ترجمہ میں لکھا ہے ....
..... شاگرد مرزا اسد اللہ خان غالبؔ دہلوی، ان کی عمر ۵۰ سے ۶۰ سال تک کی ہو گی .... دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی (۳ شعر[1])

بے خبر (۱۸۲۵ء تا ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء) غالبؔ کے شاگرد نہ تھے بلکہ دوست اور کرم فرما تھے۔ غالباً اسی دوستی کی وجہ سے نساخ کو دھوکا ہوا ہے۔

---

[1] چونکہ تذکرہ فارسی گویوں کا ہے۔ اس لیے ریختہ گویوں کے بھی صرف فارسی شعر درج ہیں۔

(۴۳)

سوانح عمری از راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء

خواجہ غلام غوث خاں (بے خبر) ولد ظہور اللہ خاں کشمیری غالب کے اخیر عمر کے دوستوں میں تھے۔ غالب کے مجموعۂ خطوط 'عودِ ہندی' کے لیے خطوط کی فراہمی میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ ان کے خالو سید محمد خاں، لیفٹیننٹ گورنر شمالی و مغربی کے، میر منشی تھے۔ انھیں نے ۱۸۴۰ء میں بے خبر کو اپنا نائب مقرر کرایا تھا۔ بعد میں وہ اپنے خالو کی جگہ میر منشی مقرر ہوئے۔ راجہ شیو پرشاد، جو بے خبر کے ہم عصر تھے، بھی انگریزی راج کے زمانے میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے۔ راجہ اور ستارۂ ہند کے خطاب انھیں حکومت ہی کی طرف سے ملے تھے۔ ان کی سوانح عمری میں ایک جگہ بے خبر کا بھی معمولی سا تذکرہ ہے مگر اس تذکرے کی نسبت وہ واقعہ زیادہ دلچسپ ہے جس میں بے خبر کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ یہ بات ۱۸۵۲ء سے پہلے کی ہے اور سوانح عمری کے ص ۵۹ پر درج ہے۔

"ڈیوک آف اڈ بزگ لفٹننٹ گورنر کے ساتھ تھے۔ میں میر منشی۔۔۔۔۔ خواجہ غلام غوث (بے خبر) کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دن اتوار کا تھا۔ خواجہ صاحب (بے خبر) نے خضاب لگایا تھا۔ یکایک ڈیوک کا اردلی آیا کہ منشی صاحب (بے خبر) کو بلایا ہے۔ منشی صاحب (خضاب کے سبب) گھبرائے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے بدل میں جاتا ہوں۔ جب میں نے جا کر سلام کیا اور کرسی پر بیٹھا مجھ کو ایک عرضی دی پڑھنے کے لیے۔ میں نے پڑھ کر۔۔۔۔۔ انگریزی میں ترجمہ بھی سمجھا دیا۔ وہ عرضی تھی۔۔۔۔۔ منجانب تمام کایتھانِ ہندوستان۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ ہم۔۔۔۔۔ گپت جی کی اولاد ہیں۔ بھگوان نے

قلم کا حق اور ورثہ ہم لوگوں کو دیا ہے ...... آپ حکم
دے جاؤ کہ سوائے کایتھوں کے کوئی دوسری قوم کا آدمی
ہندوستان بھر میں قلم نہ چھونے پاوے۔ ڈیوک ہنسے
اور عرضی اپنے پاس رکھ لی۔ شاید ولایت کے عجائب خانے
میں ہندوستانیوں کی سمجھ اور عقلمندی کا نمونہ دکھلانے
کو دے دی ہو۔"

(۴۴)

انتخابِ صبا۔ اترپردیش اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۸۲ء

ص ۱۰۰ صبا۔ روکیں سمندِ عمر کو ہم کس مقام پر ٭ کیا اختیار اس فرسِ بے لگام پر
غالب۔ رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے ٭ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ص ۱۰۴ صبا۔ روزِ شبنم سوئے خورشید رواں ہوتی ہے ٭ جان ہو گی طرفِ یار روانہ کب تک
غالب۔ پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ٭ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

صبا۔ نقدِ جاں کو تنِ خاکی کہیں رکھ سکتا ہے ٭ دیکھیں اگلے یہ خرابہ نہ خزانہ کب تک
غالب۔ از تبسم بجاں نقاب تا کے ٭ ایں گنج دریں خراب تا کے

ص ۱۱۵ صبا۔ سُن لے کبھی مجھ فقیر کی بھی ٭ اللہ کرے ترا بھلا ہو
غالب۔ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا ٭ اور درویش کی صدا کیا ہے
غالب کے ہم عصر میر وزیر علی صبا شاگرد آتش لکھنوی شاعروں میں بلند مقام
رکھتے ہیں۔ تاہم ان اشعار کے تقابل سے غالب کے اسلوب کی برتری سے
ظاہر ہے۔

غالبؔ کے ایک اور لکھنوی ہم عصر برقؔ شاگرد ناسخؔ کا یہ شعر دیکھیے ؎

خم منہ سے لگائیں گے تڑپائیں گے جو شیشہ
چلو ہی سے پی لیں گے جو ساغر نہ ملے گا

لیکن غالبؔ کے اس شعر کے سامنے یہ شعر کم رتبہ ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

(۴۵)

بین الاقوامی غالبؔ سیمینار (ص ۳۶) مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۱۹۶۹ء

قاضی عبدالودود مرحوم فرماتے ہیں۔

"(غالبؔ کا) خط اسمی شادؔ عظیم آبادی، اس صدی کے اوائل میں ایک ماہنامے نے شائع کیا تھا۔ اس کی فارسی، غالبؔ کی فارسی نہیں۔"

یہ خط جس کی طرف قاضی صاحب نے اشارہ کیا ہے، اردوئے معلّٰی، اکتوبر ۱۹۰۲ء جلد ۳، نمبر ۴ (ص ۳۸) مرتبہ حسرت موہانی، میں شائع ہوا تھا اقتباس مع تمہید و حاشیہ یہ ہے۔

"حضرت مولانا شادؔ مدظلہ (عظیم آبادی)

۱۲۷۴ ہجری یا ۱۲۷۵ ہجری میں جبکہ آپ کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی لفظ 'گیت'، کے مذکر و مونث ہونے میں یہاں کے بعض حضرات میں گفتگو ہوئی۔ فریقِ مخالف اس لفظ کے مذکر ہونے کو نہ مانتے تھے تو حضرت نے ایک خط جناب مرزا دبیرؔ مرحوم کی خدمت میں تحریر کیا۔ جب کئی ہفتے تک

جواب نہ آیا تو ایک منظوم خط جناب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مغفور کی خدمت میں بھی بھیجا۔ حضرت غالبؔ نے اس نظم کو بہت پسند کر کے جو جواب لکھا تھا وہ اس زمانے میں دست بدست پھرا کیا۔ اور لوگوں کی زبانی یاد ہو گیا وہ خط ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ " اورنگ نشینِ فصاحت، زیب وسادۂ بلاغت! سلامت۔ نظم دلپسند یافتم و بر رسائیِ ذہن و قادِ گرامی عش عش ہا گفتم اینکہ لفظ گیت بروزن میت معمولِ ہندوستان را ازیں گم کردۂ راہِ حقیقت تحقیق فرمودی نہ آں جنا نست کہ دریں ہیچ کوشِ اسد اللہ مرزا دبیر سلم اللہ القدیر بپاسخ آں نہ گرایید اینجا مذکرش خوانند۔ زیادہ عشق خاکپائے اسد اللہ غالبؔ ۔۔۔۔"

(ب) جناب اکبر حیدری غالب نامہ (جنوری ۱۹۹۰ء) کے ص ۱۳۱ پر لکھتے ہیں " [راقم السطور یعنی] سیّد علی ہاشم مرحوم عظیم آبادی ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کے مضامین ۔۔۔ اردوے معلّٰی ۔۔۔۔ اور ۔۔۔ مخزن لاہور کے ابتدائی پرچوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے تھے" پھر لکھتے ہیں کہ " یہ خط واقعی نادر و نایاب ہے اور غالبؔ کے کسی مجموعے میں نہیں ملتا ہے"

عرض ہے کہ یہ خط میں نے ۵؍ نومبر ۱۹۸۵ء کے ہماری زبان میں شائع کرا دیا تھا۔ ظاہر ہے جناب اکبر حیدری سے

ؔ حضرت غالبؔ کے خط ہذا کی نقل راقم سطور کے والد ماجد جناب حکیم سیّد احمد مغفور نے اسی زمانے میں اپنی کتاب پر لکھ رکھی تھی۔ میں اس کی نقل یہاں درج کرتا ہوں۔

کو علم نہیں کہ قاضی عبدالودود مرحوم ۲۱ سال پہلے ہی اس خط کو یہ کہہ کر مسترد کر چکے ہیں کہ اس خط کی فارسی غالب کی فارسی نہیں۔

(۴۶)

رسالہ کشتۂ ناز۔ امرتسر دسمبر ۱۸۹۷ء جلد ۱ نمبر ۶۔ ایڈیٹر ایچ، ڈی، صوفی ص ۲۰

" ذوق اور غالب کی معرکہ آرائی۔

یہ ایک مشہور بات ہے کہ اساتذۂ دہلی نے ایک دفعہ جرس کی تیلیاں اور عکس کی تیلیاں بنانی شروع کی تھیں۔ ان دنوں محمد ابراہیم ذوق اور مرزا نوشہ غالب مد مقابل سمجھے جاتے تھے۔ حضرت ذوق کے ہاں مرزا نوشہ پہنچے۔ یہ غزل کہہ رہے تھے اور ایک اخیری مصرع کے پیش مصرع کی جستجو میں تھے۔ غالب تاڑ گئے کہ ہو نہ ہو غزل مشاعرہ کی ہے۔ پوچھا کہیے کس سوچ میں ہو؟

ذوق۔ (جوش میں) ایک مصرع کہا ہے پیش مصرع کی تلاش ہے۔

غالب۔ بھلا ہم بھی سنیں وہ مصرع کیا ہے؟

ذوق۔ یار کا (کی) چلمن ہو اور پائے نگس کی تیلیاں

غالب۔ واہ صاحب قے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ کھلواؤ تو بتائیں

ذوق۔ جو فرمائیے گا

غالب۔ تم نے (کو) کھلوانے کو کہا ہے لو سنو!

ذوق تیری شعر گوئی ہے عبث دنیا کے بیچ
یار کا چلمن ہو اور پائے نگس کی تیلیاں

بندہ پرور یہ وہ چلمن ہے کہ جس کے واسطے
چاہیے عشّاق کے تارِ نفس کی تیلیاں"

یہ محض گپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوق نے ایک شعر کہا تھا ؎
چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائی اس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

اس پر گھنشیام رائے عاصی نے قطعہ لکھا تھا ؎
۱۔ ذوق اتنا شعر گوئی کا، عبث، کس واسطے
۲۔ قافیے میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
۳۔ آپ ہی منصف ہوں اے صاحب! ذرا بہرِ خدا
۴۔ یار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں
۵۔ شیخ صاحب! یہ وہ چلمن ہے کہ جس کے واسطے
۶۔ باندھیے گر ہو سکے تارِ نفس کی تیلیاں

رسالہ کشتۂ ناز کے مضمون نگار نے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اس نے مصرع (۱) کو غالب کی زبان سے اس طرح کہلوا دیا ؎
ذوق تیری شعر گوئی ہے عبث دنیا کے بیچ
اور مصرع (۴) کو مصرع (۱) کے ساتھ مربوط کر کے شعر مکمّل کر دیا۔ مصرع (۲) اور (۳) کو قطعی حذف کر دیا تیسرے شعر (مصرع (۵) اور (۶)) کو اس طرح لکھ دیا ؎
بندہ پرور یہ وہ چلمن ہے کہ جس کے واسطے
چاہیے عشاق کے تارِ نفس کی تیلیاں

؎ برین عقل و دانش بباید گریست۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ یہ تین شعر کا قطعہ گنشیام رائے عاصی کے نام سے مشہور ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے پہلے دو شعر شاہ نصیر کے

ہیں صرف تیسرا شعر عاصی کا ہوسکتا ہے۔ میرے کتب خانے میں شاہ نصیر کا دیوان چمنستان سخن مطبوعہ ۱۳۱۴ھ (۹۷/۱۸۹۶ء) موجود ہے اور یہ اشعار اس کے ص ۱۴۱ پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ تینوں اشعار وہاں بھی قطعہ بند ہیں۔

اور تیسرا شعر یہ ہے ؎

تھے گرفتارِ قفس جو پیشِ مرغانِ چمن
مانعِ پرواز تھیں ان کی قفس کی تیلیاں

اس شمارے میں جلال لکھنوی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے ؎

لاکھ خاموش ہو کب بند یہ تقریر میں ہے
بول اٹھنے کی بھی طاقت مری تصویر میں ہے

اس ضمن میں میری کتاب سہو و سراغ میں اس شعر پر بحث دیکھیے ؎

جس کم سخن سے میں کردوں تقریر بول اٹھے
مجھ میں کمال وہ ہے کہ تصویر بول اٹھے

(۴۷)

غالب شکن (دوآتشہ) مرزا چنگیزی لکھنوی۔ ۱۹۲۵ء

ص ۵۴۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
(غالب)

اے گل بتو آمدی زر میں گو چگونہ اند
آں روے یا کہ در تہ گردِ فنا شدند
(امیر خسرو)

اور بھی بہت سے فارسی، اردو شعرا نے یہ مضمون باندھا ہے مثلاً ؎

زنہار قدم بخاک آہستہ نہی
کیں مردمک چشم نگارے بوداست
(نامعلوم)

دربہر دشتے کہ لالہ زارے بودست | آں لالہ ز خونِ شہریارے بودست
ہر برگ بنفشہ کز زمیں مے روید | خالے ست کہ بر رخِ نگارے بودست

(عمر خیام)

خلقے بہ عدم دودِ عدم داغِ جگر بُرد | خاکِ ہمہ صرفِ گل و سنبل شدہ باشد

(بیدل)

ہیں مستحیل خاک سے اجزائے نوخطاں | کیا سہل ہے زمیں سے نکلنا نبات کا
ہر قطعۂ چمن پہ ٹک گاڑ کر نظر کر | بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنا ہے
گو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن | خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

(میر)

گئے جہان سے کیا کیا ستیزہ رو تہِ خاک | کہ گُل عدم سے جو آیا بہت فگار آیا

(سودا)

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں | اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

(ناسخ)

تھے گل یہ خطِ عارضِ خوبانِ سبز رنگ
کہتی ہے آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا

(نظیر)

فلک پہ چند گل بوٹے جو نکلے بھی تو کیا نکلے
گئی جو خاک میں وہ اچھی صورت پھر نہیں نکلی

(ناطق)

آخر میں تفنّنِ طبع کے لیے راقم بھی اپنی ایک پُرانی غزل کا شعر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے ؎

وہی جمال، وہی رنگ، تمکنت بھی وہی
یہ پھول نکلے زمیں سے کہ نازنیں نکلے

(۴۸)

تذکرۂ شمیم سخن ۔ مولوی محمد عبدالحیٔ صفا بدایونی

ص ۱۰ پر مؤلف لکھتے ہیں :

اس تذکرے میں صرف وہی شاعر جلوہ افروز ہیں کہ جو ۱۲۸۸ ھ (۷۲-۱۸۷۱ء) یا اس کے بعد رونق افزاء عالم ہستی تھے ....

.... اور جب یہ تمام ہوا تو ۱۲۸۹ ھ (۷۳/۱۸۷۲ء) تھے۔"

تذکرے میں اس بیان کا بالکل الٹ ہے شاید سہو کاتب ہے بعد کی جگہ مؤلف نے پہلے لکھا ہوگا ۔ ص ۲۹ پر درج ہے ۔

" اختتام جلد ہٰذا پر مجھ کو ضرور ہے کہ ان حضرات کا شکریہ ادا کروں جو میری اس تالیف میں معین رہے ۔ سب سے پہلے مجھ کو حضرت مولانا عبدالغفور خاں صاحب نسّاخ ڈپٹی مجسٹریٹ ڈھاکا کا شکر گزار ہونا چاہیے ..... اس کے بعد مولوی شیخ فدا حسین صاحب فدا وکیل علی گڈھ، منشی گلاب سنگھ مشتاق ..... منشی درگا پرشاد صاحب نادر دہلوی صاحب تذکرۂ شعراء دکن و تذکرۂ چمن انداز و گلشن ناز ..... حکیم علی احمد ..... بدایونی و ...... علی امجد حسین صاحب امجد بدایونی کو بھی بھولنا نہ چاہیے یہ حضرت بھی میری اس تالیف میں ہر وقت معین رہے ۔"

ص ۵۵ پر لکھا ہے ۔

" غالب و اسد تخلص ..... نادر دہلوی اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں لکھتے ہیں کہ بعض ثقات کی زبانی معلوم ہوا کہ مرزا صاحب (غالب) کو شاہ نصیر مرحوم سے تلمذ

حاصل تھا۔ واللہ اعلم یہ قولِ نادر کہاں تک صحیح ہے۔۔۔۔۔۔"

اس وقت مضمون نگار اور رسالے کا نام یاد نہیں مگر میں نے کسی رسالے میں ایک مضمون اس نوعیت کا دیکھا تھا۔ اس میں غالبؔ کے کسی ہم عصر کا شعر بھی درج تھا جس میں غالبؔ کو نصیرؔ کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ درگا پرشاد نادرؔ کے تذکرۂ شعرائے دکن کا صحیح نام "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں نصیرؔ (شاہ نصیر) کے ترجمے میں لکھا ہے " دہلی کے اکثر شاہزادوں اور امیرزادوں نے ان کی شاگردی کا دم بھرا۔ دیکھو میر حسن تسکینؔ مومن خاں مومنؔ اور مرزا نوشہ غالب" مگر اس سے وہ حاشیہ زیادہ اہم ہے جو نادرؔ نے اس عبارت پر لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

" جناب نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المعروف بہ مرزا نوشہ صاحب تخلص بہ اسدؔ و غالبؔ جو اپنے تئیں شاگردِ خالق اور استادِ مخلوق سمجھتے رہے ان کی نسبت صاحبِ گلستانِ بے خزاں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ شخص نظیرؔ اکبر آبادی اور اس کے بیٹے میر گلزار علی اسیرؔ کے شاگرد ہیں۔ میں نے جو ایک شاعرِ عمر رسیدہ سے سن کر ان کو نصیرؔ کا شاگرد دیکھا ہے تو اکثر شعراءِ دہلی نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے۔ واقعی غالبؔ نے اشعارِ اردو کی کسی سے اصلاح نہیں لی۔۔۔۔۔۔ دلی کے ایک شخص کنھیا لال صاحب وحشیؔ تخلص نے اس کا (تذکرہ گلستانِ بے خزاں کا) مختصر سا جواب الجواب چھپوایا ہے اور وہ بھی ملاحظہ کے لائق ہے۔۔۔۔"

ص ۲۶۱ پر مؤلفِ تذکرہ اپنے استاد (مذاقؔ بدایونی) کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں" ۔۔۔۔۔ اٹھارہ برس کی

عمر میں آپ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ خواجہ حیدر علی آتش و شیخ امام بخش ناسخ کے جلسوں میں شریک ہوئے اور شعر کہنا شروع کیا عیار تخلص رکھا۔ تھوڑے روز قیام فرما کر بدایوں واپس آئے۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور علوم عربی و فارسی میں کامل تحصیل فرمائی۔

حضرتِ خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور فی البدیہہ یہ قطعہ عرض کیا ؎

کیا کروں عرضِ اشتیاق اپنا	شعر کہنا غرض تھا شاق اپنا
ذوق تھا یہ ترے تلمذ کا	کہ تخلص کیا مذاق اپنا

...... حضرت خاقانیِ ہند مرحوم (نے) یہ قطعہ سُن کر داخلِ تلامذہ کیا۔ آپ (مذاق) اکثر ...... مومن ...... غالب اور دیگر شعرائے نامی دہلی کے جلسوں میں شامل رہتے تھے ـــــــــ"

ص ۲۶۳ پر درج ہے۔

"مرزا اسد اللہ خاں غالب (جن کی استادی و صاحب کمال ہونے کا ہر شخص مقر ہے) اپنے خط مورخہ ۲ اکتوبر ۱۸۵۰ء موسومہ مفتی سید احمد خاں ؒ میں نسبت مولانا مذاق مدظلہ تحریر فرماتے ہیں)۔

"مشفقی مولوی دلدار علی صاحب کہ بدانست بندہ در معنی آفرینی با سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق برابر و بہ اعتقادِ خویش، شاگردِ آں دیرینہ سخنور اند،

حاشیہ صہ ۹۹ پر دیکھیے

آخر نہ ہمدم و ہم نشینِ آں والا گہر اند،
چرا با ایشاں در سخن مشورت نہ رود،

(۴۹)

دو ماہی سفینہ شمارہ (۱۳) ستمبر / اکتوبر ۱۹۸۴ء ص ۹

..."غالب کا اپنی شادی سے پہلے بھی دہلی میں آنا جانا تھا۔ ۱۳ سال کی عمر میں ان کی شادی معروف کی بیٹی سے ہوئی۔ اس لیے تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ مستقلاً دہلی باشی ہو گئے۔ وہاں شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ شاہ نصیر جگت استاد تھے۔ وہ نہ صرف مومن و ذوق کے بلکہ معروف کے بھی استاد تھے۔ معروف نے اپنے داماد غالب کو بھی شاہ نصیر کی طرف رجوع کرایا ہوگا۔ کسی نے جانا کسی نے نہ جانا۔ مگر گھر کا ایک بھیدی حافظ غلام رسول شوق جو خود بھی نصیر کا شاگرد تھا اس سے بات کب چھپی رہتی اس کا ایک قطعہ سنیئے جس سے غالب کی شاگردیِ نصیر ثابت ہوتی ہے ؎

مومن و آزردہ، غالب، ذوق و شوق — شاعری کے فن میں سب مل ایک ہیں
فیض سے جن کے ہوئے ہیں فیض یاب — وہ نصیر استاد کامل ایک ہیں

حسرت موہانی مرحوم اردوئے معلیٰ شمارہ دسمبر ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں کہ"..... مرزا غالب بھی اگرچہ (شاہ نصیر کے) شاگرد نہ تھے لیکن ان کی استادی کے قائل تھے۔

حاشیہ صـ۹۸ کا۔ سید تخلص شاگردِ غالب ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے کالے پانی کی سزا ہوئی۔ وہیں جزیرہ انڈمان میں انتقال کیا۔

ان کی مشہور غزل

؎ تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

وہی بات ڈاکٹر عبدالرزاق نے بھی کہی ہے۔ دیکھیے ان کا مضمون بعنوان مرزا غالب اور شاہ نصیر (مطبوعہ صحیفہ لاہور غالب نمبر حصّہ پنجم، اپریل ۱۹۷۳ء) - نیز دیکھیے غالب نامہ (جنوری/اپریل ۱۹۷۶ء ص ۴۵)

(۵۰)

تذکرہ غزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم۔ درگا پرشاد نادر دہلوی مطبوعہ مارچ ۱۸۷۹ء

ص ۸۹ "...... غالب معروف بہ مرزا نوشہ صاحب مرحوم کے شعر پر ...... میر علمدار حسین صاحب ساکن بنیٹرہ ضلع بجنور سابق طالب علم دہلی کالج نے جو لاہور کے کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہ کر رہگرائے عالمِ بالا ہوئے، اعتراضاً وجواباً شعر کہا تھا ؎

غالب: ہم جب کریں گے توبہ شراب و کباب سے
قرآں میں اگرچہ کلوا واشربوا نہ ہو

جواب (از میر علمدار حسین)

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب
جب آگے واشربوا کے ولا تسرفوا نہ ہو

نسخہ بہ خطِ غالب (۱۸۱۶ء) میں اسی زمین میں ۷ شعر کی غالب کی غزل موجود ہے جس کا مطلع ہے ؎

بے دردِ سر بسجدہ الفت فرو نہ ہو
چوں شمع غوطہ داغ میں کھا گر وضو نہ ہو

مگر مندرجۂ بالا شعر موجود نہیں۔ دونوں ہی شعر میر علمدار حسین صاحب کے دماغ کی اُپج ہیں۔

پہلے شعر میں 'اگرچہ' کے بجائے ... شاید 'اگر یہ' ہوگا۔

ص ۱۶۵ - "پس مرزا جواں بخت کی شادی میں خاقانیِ ہند (ذوقؔ) نے جو سہرا کا مقطع لکھا تھا

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

اور غالبؔ علی کُلِ غالب نے یہ مقطع کہا تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

اس پر استادِ شاہ (ذوقؔ) نے اُسی وقت یہ شعر موزوں کر کے سنایا تھا ؎

جس کو دعوائے سخن ہو یہ سنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اس کے جواب میں اسد اللہ الغالبؔ نے ایک قطعہ کہا جس میں فرمایا ؎

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ثنا گر کا لفظ ذوقؔ نے نیا تراشا ہے۔ اس پر مرزا (غالبؔ) معترض ہیں، مگر یہ بات بادِ ہوائی ہے بلکہ علماء و فضلا میں اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی ہے، پس یہ بھی دو دو چوٹیں چل گئیں۔

.........."

مگر ثنا گر بمعنی ستائش گر فارسی فُصحا کے یہاں فصیح ہے اور صدیوں سے مروّج ہے۔ مثالوں کے لیے دیکھیے بہارِ عجم۔ غالبؔ جیسا فارسی گو اس ترکیب پر معترض نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم ..... درگا پرشاد نادرؔ کے قول سے یہ گتھی کہ ذوقؔ کے کہے ہوئے سہرے میں مقطع کے بعد ایک شعر کا اضافہ کیوں ہے، سُلجھ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے سہرا کہہ چکنے کے بعد شاہ ظفر نے ذوقؔ سے بھی سہرا کہنے کی فرمائش کی۔ ذوقؔ نے حکم کی تعمیل کی اور وہ اُسی روز یا دو ایک روز کے بعد سہرا فکر کر کے لائے اور حضور میں اس مقطع کے ساتھ گزرانا ؎

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

(یہاں واسطے تیرے سے مُراد جواں بخت کے واسطے ہے) غالباً سہرا سننے کے بعد بادشاہ نے غالب کا مقطع (دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا) یاد دلایا ہوگا جس پر ذوق نے فی البدیہہ آخری شعر ؎

جس کو دعوائے سخن ہو یہ سنادے اس کو — دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا کہا ہوگا۔

آزاد کا یہ قول درست نہیں معلوم ہوتا کہ ذوق نے پورا سہرا دربار میں بیٹھ کر کہہ دیا تھا۔

شیدا (خواجہ سعید ابن الخال نواب حسام الدین خان بڑودہ) کے حال میں بیان کیا ہے۔

ص ۱۷۸ "جب کہ نواب مصطفےٰ خان بہادر مرحوم جہانگیر آبادی شیفتہ تخلص صاحب تذکرۂ گلشن بے خار، شاگرد رشید مومن مغفور، کعبۃ اللہ کو جاتے ہوئے بڑودہ میں پہنچے تو نامبردہ (شیدا) بھی ملا۔ اور طرح کا شعر چاہا۔ نواب صاحب (شیفتہ) نے بعد عذرِ ماندگی شعر یہ فرمایا ؎

اصحاب تنگ کرتے ہیں فکرِ سخن کو اور
تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

سامع (شیدا) نے اُسی وقت غزل کہہ کر ملاحظہ کرائی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

بے شک عدو سے رنج اٹھاتے ہیں گھر میں ہم
آرام کے لیے ہیں خیالِ سفر میں ہم

شیدا طرح یہ مانگی تو کہتے ہیں شیفتہ
تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

نواب صاحب (شیفتہ) نے مسکرا کر آفریں کی ------"

ص ۱۳۶ [نسخے سے اقتباس کرنے سے پہلے کچھ تمہید لکھنا ضروری ہے: مولانا امام بخش صہبائی اپنے "رسالہ نادرہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ملاّ کو کبی کی

بیعت کی شرح میں سے چند ورق پڑھے۔ اس شعر (بیت) سے ۳۰۷ جداگانہ نام اعمالِ معمای کے ذریعے حاصل ہوئے تھے۔ اُسی زمانے میں یہی شعر بعض طالب علم ان سے پڑھتے تھے۔ لہٰذا انھوں (صہبائی) نے غور کر کے ۳۰۶ نام اعمال معمای کی رو سے، اس شعر میں سے نکالے اور انھیں اپنے رسالہ گنجینۂ رموز (۱۸۴۴ء) میں درج کیا۔ یہ صہبائیؔ کا بہت بڑا کارنامہ ہے مگر ہمیں کہیں ملّا کوکبیؔ کا وہ شعر لکھا ہوا نہیں ملا تھا۔ اتّفاق سے نادرؔ کے تذکرے میں اس کا اندراج مل گیا۔ نادر یوں بھی صہبائیؔ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے]

اب ص ۱۲۶ سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"...... فن (معمّا) کے شوقین کو لازم ہے کہ جناب صہبائیؔ جنّت مآوائی کا رسالہ گنجینۂ رموز، جو لوحِ طلسم کی شرح ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ لوحِ طلسم یہ ہے۔ شعر

چوں آں مہ روئے خود از پردہ بنمود
دل از ما بُرد آخر کرد نابود

جنابِ ممدوح (صہبائیؔ) نے اپنے اس شعر میں سے قریب تین سو ساٹھ کے نام نکالے ہیں۔"

نادرؔ نے اسے صہبائیؔ کا اپنا شعر کہا ہے لیکن قیاس ہے کہ صہبائیؔ نے جسے مُلّا کوکبیؔ کا شعر کہا ہے، غالباً وہ یہی شعر ہے۔ کوکبیؔ کا مجموعۂ کلام دیکھنا چاہیے۔

(۵۱)

دیوانِ غالبؔ (نسخۂ عرشی) اشاعت دوم ۱۹۸۲ء

ص ۱۲۷ (مقدمہ)

"شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں مرزا صاحب کا دیوان (پہلا ایڈیشن) اس مطبع (سید الاخبار) میں چھپنا شروع ہوا، اور ۲۷ رمضان تک اختتام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ رباعی بھی شامل ہے "ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم" اور از روے حساب دوالی اور شب قدر کا اجتماع اسی تاریخ کو ہوا تھا۔ پہلے سرورق کی تحریر اور رباعی دیکھیے

(سرورق) "دیوان اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص

مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دہلی میں سید محمد خان بہادر کے چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو سید عبد الغفور کے اہتمام میں چھپایا ہوا"

(رباعی)

ہیں شہ میں صفاتِ ذو الجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں اسفل و عالی باہم
ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

اب اس سرورق کی تحریر اور رباعی سے صاف ظاہر ہے کہ عرشی صاحب کی دی ہوئی دونوں دلیلیں ضعیف ہیں۔ دیوان کے سرورق پر یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طباعت دیوان کی تاریخ آغاز ہے۔ اگر تاریخِ آغاز کی نشاندہی منظور ہوتی تو دن کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح رباعی سے یہ کہیں نہیں ظاہر ہوتا کہ شب قدر اور دوالی کے اجتماع کی تاریخ گزر چکی ہے، اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں اس لیے خوش ہو کر گلے مل رہے ہیں کہ اب کے شبِ قدر اور دوالی بھی ایک ہی تاریخ کو باہم (بغل گیر ہونے والی) ہیں۔ رباعی یقیناً ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر)

سے پہلے کہی گئی ہو گی۔ چھپے ہوئے دیوان میں یہ رباعی جس مقام پر ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام مسودہ ایک ہی قلم سے سلسلہ وار لکھا گیا تھا۔

ص ۱۳۶ (بحوالہ دہلی اُردو اخبار ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء)

"حسب الحکم حضرت سلطانی .... جو ..... غالب اور

.... ذوق نے بہ تقریب شادی مرزا جواں[1] بخت بہادر

..... کے کچھ اشعار مبارکبادیِ سہرہ اس ہفتے میں

حضورِ سلطانی میں سر دربار گزارنے تھے ......

واسطے حظ و کیفیت .... درج کرتے ہیں۔"

پھر غالب کا کہا ہوا سہرا، ذوق کا کہا ہوا سہرا اور غالب کا "قطعۂ اعتذار" سے 'منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی' دیے ہیں۔ دونوں سہروں کے مطلعے اور آخری شعر یہ ہیں ؎

(غالب) خوش ہو اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ[2] کر سہرا

---

[1] شاہ ظفر نے بڑھاپے میں زینت محل سے شادی کی تھی۔ "خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جواں بخت نام رکھا گیا۔ انھیں کی ولی عہدی کے جھگڑوں نے قلعے میں تفرقہ ڈالا .... آخر انھیں مخالفتوں نے رنگون میں پہنچا دیا۔" (مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم) جواں بخت نے اسی جلاوطنی میں ۱۹ ستمبر ۱۸۸۴ء کو بمقام مولمین برما انتقال کیا۔

[2] بعض مقامات پر بہتر لکھا ہوا بھی دیکھا گیا ہے مگر صحیح بڑھ کر ہی ہے۔

(ذوق) اے جواں بخت! مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
جس کو دعوےٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

دہلی اُردو اخبار کے اقتباس سے التباس ہوتا ہے جیسے خود شاہ ظفر نے غالب اور ذوق کو سہرا کہنے کا حکم دیا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سہرا پہلے نواب زینت محل کے ایما سے غالب نے کہا تھا اور شاہ کے حضور میں گزرانا تھا۔ بقول مولانا آزاد اس کے مقطع کو دیکھ کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم سے چشمک ہے اور اس کے جواب میں ذوق سے سہرا لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ دہلی اردو اخبار کا یہ لکھنا کہ "اس ہفتے میں سر دربار گزرانے تھے" درست نہیں کیونکہ اوّل تو سہرے ایک ساتھ نہیں لکھے گئے "دوسرے اُس ہفتے سے" مراد تاریخ ۲۱ تا ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء ہی ہو سکتی ہے جبکہ قران السعدین (بحوالہ ذوق سوانح اور انتقاد ص ۱۱۱) اشاعت ۲۰ مارچ ۱۸۵۲ء میں قطعۂ اعتذار چھپ چکا تھا اور سہرے اُس قطعے سے پہلے ہی کہے گئے تھے۔
ص ۳۹۲ (حاشیہ)

"جہاں تک میرا علم ہے سہرا ردیف کے ساتھ غالب سے پہلے کسی نے کوئی نظم نہیں لکھی۔ اگر یہ صحیح ہے، تو مرزا صاحب اس نوع کی نظم کے موجد قرار پاتے ہیں۔"

تاہم لفظ سہرا کا استعمال غالب کے عہد سے بہت پہلے سے ہوتا ہے جیسے میر تقی میر سے

دونوں دولھا دلہن خوشی سے ملیں
کہیں سہرے کے پھول جلد کھلیں

شہزادہ جواں بخت کی اس شادی پر غالب اور ذوق کے علاوہ حکیم آغا جان عیش نے بھی سہرا کہا تھا جس کے دو شعر مرزا فرحت اللہ بیگ نے مضامینِ فرحت حصہ دوم کے ص ۲۵۸ پر درج کیے ہیں سے

آنے تک چشمِ فلک نے بھی تو دیکھا ہی نہیں
اس جواں بخت کے سہرے کے مقابل سہرا
ایسے نوشہ کے لیے ایسا ہی سہرا تھا ضرور
بندھتے ہی کیا رُخِ نوشہ پہ گیا کھل سہرا

مرزا لکھتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سہرا کہنے کا دستور اس زمانے میں عام تھا کچھ مرزا غالب کی ایجاد نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر اس زمانے میں سمجھا جاتا ہے ـــــــ" ہمیں اس سے اتفاق ہے۔

حکیم آغا جان عیش (تقریباً ۱۷۸۵ء تا ۲۶ جون ۱۸۷۴ء) غالب سے لگ بھگ ۱۲ سال بڑے تھے اور غالب کے انتقال کے بعد لگ بھگ ساڑھے پانچ سال زندہ رہے۔ آغا جان عیش نے قافیہ بدل کر سہرا کہا ہے عین ممکن ہے کہ عیش کا سہرا غالب اور ذوق سے پہلے کا فکر کردہ ہو۔

ص ۳۹۶ [غالب نے ظفر کی ایک غزل: کھنچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی کو مخمّس کیا تھا اس کا ایک شعر مع مصرعِ غالب یہ ہے ؎

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پرنم اس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو
کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی،

عرشی صاحب ظفر کے شعر کے پہلے مصرع کو اس طرح درست کرتے ہیں۔

'کہہ سکے ساری حقیقت نہ ہم اس کے روبرو' اور لکھتے ہیں]

"میں نے یہ تغیّر اس لیے روا رکھا ہے کہ غالب نے پرنم، غم اور دم قافیے لکھے ہیں ـــــــ"

عرشی صاحب نے ترمیم کرتے ہوئے یہ خیال نہ کیا کہ اس طرح نہ بروزن فع واقع ہوتا ہے نہ سکا یہ تلفظ بطور حرفِ نفی قطعاً غلط ہے اور اس کی مثال اساتذہ کے ہاں کہیں نہیں ملتی اس لیے یہ ترمیم نامناسب ہے

قیاس ہے کہ مصرع یوں ہوگا ؎

کہہ سکے ساری حقیقت کب ہم اس کے روبرو

اور موقع محل کے لحاظ سے بھی یہی صحیح ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ مخمّس چھپنے کے لیے اردو اخبار (۱۷ اپریل ۱۸۵۳ء) میں دیا ہوگا تو وہیں سہواً کاتب نے ایسا لکھ دیا ہوگا اور بعد میں اسی طرح دیوان میں چھپ گیا۔ ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ غالبؔ نے مصرعے لگائے ہوں اور اس میں قوافی درست نہ ہوں یا شعر میں ایسی فنّی غلطی رہ گئی ہو۔

(۵۲)

(دیوانِ غالبؔ۔ پہلا ایڈیشن مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء ص ۶۴)

؎ "بہنیں میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

اس کا ظاہراً مطلب تو یہی ہے کہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ جب وہ پالکی میں میرے کوچے سے گزرتے ہیں تو انھیں وہاں کہاروں کا کندھا بدلنے کے لیے ٹھہرنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔

شعر قطعی عامیانہ اور جوہرِ شاعری سے خالی ہے۔ مولانا حسرت موہانی، شرحِ دیوانِ غالبؔ کے مقدمے میں "مرزا کی شاعری" کے تحت لکھتے ہیں کہ "اس شعر کا پست مذاق مرزا کی شانِ شاعری کے بالکل خلاف ہے"

کلامِ غالبؔ کے کئی شارحین نے اس شعر کو ایک واقعے پر مبنی بتایا گیا ہے

آسی الدنی "مکمل شرحِ دیوانِ غالب میں" جس کا مقدمہ انھوں نے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو لکھا تھا، تحریر فرماتے ہیں

" بعض لوگوں سے سنا کہ یہ شعر قصہ طلب ہے۔ حکیم مومن خاں ایک مرتبہ مرزا کے مکان کے سامنے سے گزرے، مرزا صاحب نے دیکھ لیا کہ پالکی میں کون ہے۔ مگر کچھ بولے نہیں، مگر حکیم صاحب کو کہاروں سے یہ کہتے سُنا کہ جلدی چلے چلو۔ جب وہ چلے گئے تو مرزا نے یہ شعر کہا اور حکیم صاحب کو بھیج دیا۔ اس کے بعد حکیم مومن مرحوم نے بہت عذر خواہی کی۔ واللہ اعلم"

پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ نے الہاماتِ غالب (اصل مسودے کی تکمیل ۱۹۳۴ء میں ہوئی) میں اور آغا محمد باقر نے بیانِ غالب (جس کا مقدمہ ۲۹ر مئی ۱۹۳۹ء کو مکمل ہوا تھا) میں یہی قصہ دہرایا ہے۔ مگر " بیانِ غالب" میں حکیم مومن کی جگہ مولانا آزردہ کا نام لکھا ہے۔

سیّد اولاد حسین شاداں بلگرامی نے "روح المطالب فی شرحِ دیوانِ غالب (اردو)" کا مقدمہ اپریل ۱۹۴۶ء میں رقم کیا تھا۔ وہ اس شعر کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

" سنتا ہوں کہ جناب بےخود دہلوی نے اس شعر کے متعلق واقعۂ ذیل لکھا ہے کہ حکیم مومن خاں صاحب یا منشی صدرالدین آزردہ غالب کے کوچے سے پینس پر گزر رہے تھے کہ ان کے مکان کے سامنے کہاروں نے کندھا بدلنا چاہا تو حکیم صاحب نے انھیں روکا، جس کو غالب نے سُن لیا (کہیں جانے میں جلدی مقصود ہوگی) تو یہ شعر ان کو لکھ کر بھیجا۔ جس پر حکیم صاحب نے معذرت کی۔ . . . . . چونکہ واقعہ جناب بےخود دہلوی کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں اس لیے اس کے بدمذاق ہونے کا خیال اکثر کو ہوگا۔"

اگر یہ واقعہ سچا ہے تو یہ ۱۸۲۸ء اور ۱۸۳۳ء کے درمیانی وقفے کی بات ہوگی

کیونکہ "گلِ رعنا" (۱۸۲۸ء) میں یہ شعر درج نہیں مگر "نسخۂ رام پور اوّل یا قدیم" (۱۸۳۳ء) کے متن میں درج ہے اور اس کے بعد دیوانِ غالبؔ (اردو) کے ہر مطبوعہ نسخے میں شامل ہے۔ یہ شعر یقیناً کسی غزل کا نہیں، جہاں کہیں درج ہے یہی ایک شعر ملتا ہے، گویا ہنگامی شعر ہے اور کسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے۔ اس لیے یہ جاننے کو جی چاہتا ہے کہ آخر وہ کون سا جذباتی لگاؤ ہے جس نے مرزا کو عمر بھر مجبور کیے رکھا کہ وہ اس شعر کو مستقل طور پر اپنے دیوان میں جگہ دیتے رہیں۔

شرحِ دیوانِ غالبؔ از بےؔخود دہلوی میں تو اس واقعہ کا ذکر نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آسی الدّنی نے بےؔخود مرحوم سے سُن کر اپنی شرح میں نقل کیا ہو۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق یہ واقعہ پہلے پہل حضرت آسی الدّنی ہی معرضِ تحریر میں لائے ہیں۔

یادگارِ غالبؔ میں بھی ایک ایسا ہی لطیفہ بیان ہوا ہے۔ کہیں آسیؔ مرحوم نے اسی بنیاد پر تو اپنا قصّہ تعمیر نہیں کر لیا؟ لطیفہ یہ ہے

> "ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں، جب یہ واقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے"

(۵۳)

"ماہِ نو" کراچی - فروری ۱۹۵۰ء - مضمون مولوی احتشام الدین

غالب کے بعض غیر مطبوعہ اشعار اور لطیفے، کے تحت یہ شعر بھی درج ہے ؎

" گاتی تھیں شمرو کی بیگم ، تن نا ہا یا ہُو
دودھ میں بچے تھے خلغم ، تن نا ہا یا ہُو

مجھے اوّل تو اس شعر کو غالب سے منسوب کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی دوسرے خیال تھا کہ یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے ہی کا ہوگا کیونکہ ایسے چونچلے غالب کو اس کے بعد کہاں سوجھے ہونگے اور انھوں نے تن نا ہا یا ہُو کی سی ظریفانہ ردیف کاہے کو روا رکھی ہوگی ۔ مگر شواہد اس کے برعکس نکلے ۔ ملاحظہ کیجیے :

(۱) آخر مئی ۱۸۶۵ء میں غالب اپنے خط بنام ہرگوپال تفتہ (غالب کے خطوط اوّل ص ۳۵۲) میں لکھتے ہیں ۔

تم نے تن تن کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ لکھا نہ تھا۔
تن تن اور تننا اصوات ہیں تار کے ، ہندی و فارسی میں مشترک ۔

(۲) ، ۱۸۶۷ء (سیزدہم ماہ ربیع الثانی سالِ یک ہزار و دوصد و ہشتاد و چہار ہجری) میں غالب کا کچھ فارسی کلام سبد چین کے نام سے شائع ہوا ۔ اس کے ص ۲۷ پر غالب کی ایک ۱۱ شعر کی غزل ہے مطلع اور مقطع یہ ہے

ہلّہ من عاشقِ ذاتم تننہ نا ہا یا ہُو ؎
ناظرِ حسنِ صفاتم تننہ نا ہا یا ہو

غالبم تشنۂ تلخاب نہ ہمچوں حافظ
مائلِ شاخِ نباتم تننہ نا ہا یا ہُو

۱۹۶۹ء میں جب وزیر الحسن عابدی مرحوم نے "سبد چین" کا ایک ایڈیشن مجلس یادگارِ غالب لاہور سے شائع کیا تو اس کے ص ۱۲۳ کے نیچے یہ تفصیلی حاشیہ دیا جو معنی خیز ہے لکھا ہے۔

"نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کی بیاض میں ایک خط نقل ہوا ہے جو غالب نے نواب امین الدین احمد خاں کو بھیجا تھا۔ اس خط کے ساتھ غالب نے یہ غزل بھیجی تھی اور اس کے بارے میں خط میں لکھا تھا: برادر۔۔۔۔۔ ایں غزل بجوابِ غزلِ حزیں است۔ ہلہ من جانِ جہانم تننا ہا یا ہو، اس بیاض کا حوالہ اور مذکورہ خط کا اقتباس راقم نے دہلی میں محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کی وساطت سے جناب مرزا شمس الدین برلاس لوہارو کی بیاض سے لیا تھا"

یہ غزل غالب کے مجموعۂ نظم و نثرِ فارسی "باغِ دو در" میں بھی شامل ہے اس قلمی نسخے کی کتابت ۷ جولائی ۱۸۶۷ء کو ختم ہوئی تھی۔

(۲) ستمبر ۱۹۶۷ء میں چھپی "کلیاتِ غالب (فارسی) جلد سوم" میں اس غزل کے حاشیے میں سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی لکھتے ہیں۔

ایں غزل در دیوانِ چاپ دہلی و کلّیاتِ چاپ لکھنؤ موجود نیست۔۔۔۔۔ متن ایں غزل از ماہنامہ ذخیرہ بال گوبند، یازدہ شعر، آگرہ، ستمبر ۱۸۹۸ء گرفتہ

مندرجہ بالا میں (۱) سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے یہ فارسی غزل ۱۸۶۵ء کے اوائل میں مکمل کر لی تھی مگر ہرگوپال تفتہ کو ابھی نہیں بھیجی تھی تفتہ کو یہ کہیں سے دستیاب ہوگئی۔ اسے اس کی ردیف کچھ عجیب سی لگی۔ "ہا یا ہو" یعنی شور و غوغا تو اسے معلوم تھا مگر تن تن، تننا یا تننا کی تہہ تک

۱۔ انوری ۔ ملک از مجلسِ انسِ تو برانہ ہا یا ہو

اس کی رسائی نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے اس نے استاد (غالب) سے استفسار کیا۔ استاد نے جواب دیا کہ یہ آوازیں تار چھیڑنے سے نکلتی ہیں اور کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تار کی آوازوں کے لیے یہ لفظ رائج ہے۔

غالب کی زندگی میں غالب کا کلیاتِ نظم فارسی آخری بار ۱۸۶۳ء میں لکھنؤ سے چھپا تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ ۱۸۶۵ء کی کہی ہوئی غزل اس میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ اور کلام ۱۸۶۷ء میں (سبد چین) کے نام سے چھپا۔ چنانچہ اس میں یہ غزل شامل ہے۔ دیر سویر یہ غزل ذخیرہ "بالگوبند"، آگرہ کو بھیجی گئی ہوگی جہاں یہ ستمبر ۱۸۶۸ء کے شمارے میں چھپی مقطع میں۔ (۲) غالب نے حافظ کے جس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ شاید یہ ہو ؎

بادۂ تلخ از لبِ شیریں لباں
در حلاوت می برد آب از نبات

اب رہا یہ سوال کہ حزیں کی وہ کونسی غزل ہے جس کے جواب میں غالب نے یہ غزل کہی تو یہ بھی ۱۱ شعر ہی کی غزل ہے جو دیوانِ حزیں میں موجود ہے۔ مطلع اور مقطع ملاحظہ فرمائیں،

ہلہ من جانِ جہانم تنہ نا ہا یا ہو	مظہرِ آیت و شانم تنہ نا ہا یا ہو
آنچناں محوِ تماشا شدم امروز حزیں	کہ خود از یار ندانم تنہ نا ہا یا ہو

خواجہ احمد عباس مرحوم کی ایک فلم "آسمان محل" میں ایک فقیر یہ گیت گاتا ہے۔
؎ تن تن نا تن تن نا، تن تن نا، ہا یا ہو — یہ گیت علی سردار جعفری کا لکھا ہوا ہے میں نے جعفری صاحب سے پوچھا کہ انھوں نے یہ ردیف کہاں سے لی، فرمایا "غالب سے"۔ لیکن دیکھنا چاہیے غالب نے اسے کہاں سے لیا؟ عرض ہے کہ شیخ علی حزیں سے[1]۔

معلوم ہوتا ہے "گاتی تھیں شمرو کی بیگم ------ ہا یا ہو والا فقرہ بھی غالب نے انھی ایام یعنی اوائل ۱۸۶۵ء میں چست کیا ہوگا۔

---

[1] ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۰۳ھ تا ۱۱۸۰ھ جمادی الاول (۱۶۹۱ء — ۱۷۶۶ء)

(۵۴)

دیوانِ (کلیات) فارسی غالب۔ پہلا ایڈیشن۔ مطبوعہ ۱۸۴۵ء ص ۲۵

"اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ
کے بہ پُر گوئی فلاں در شعر ہم سنگِ من است"

اس قطعے کے کُل شعر ۱۹ ہیں تیسرا اور چوتھا شعر یہ ہے ؎

"نیست نقصاں یک دو جزو است از سوادِ ریختہ
کاں دژم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است"

اور چودھواں شعر یہ ہے ؎

"دیدہ ور سلطاں سراج الدین بہادر شہ کہ او
آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ من است"

شاہ (سراج الدین) ظفر ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت نشین ہوئے تھے۔ گویا یہ قطعہ جو کہا جاتا ہے کہ غالب نے ذوق سے خطاب کر کے کہا ہے، ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء اور ۱۸۴۵ء (سالِ طباعتِ کلیاتِ فارسی غالب) کے مابین کسی وقت فکر کیا ہوگا۔ مجموعۂ اردو کا ذکر بھی کیا ہے اس لیے ۱۸۴۱ء کے بعد شاید ۱۸۴۲ء کا کہا ہُوا ہو۔ غالب کہتے ہیں یہ کوئی ایسا گھاٹے کا سودا نہیں اگر میں نے اُردو میں ایک دو جزو کا مجموعۂ کلام تصنیف کیا ہے کیونکہ یہ میرے فرہنگ کے نخلستان کا ایک معمولی پتّا ہے۔ اگر رنگ رنگ کے نقوش دیکھنا چاہتے ہو تو میرا فارسی کلام دیکھو اور میرے اردو کے پھیکے مجموعۂ اردو کو نظر انداز کر دو، مگر غالب یہ قطعہ لکھتے ہوئے بھول گئے کہ ۱۸۴۲ء سے بیس بائیس سال پہلے وہ خود ۱۸۲۱ء کے قلمی نسخے میں لکھ آئے ہیں کہ ؎

ے یہ جو کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

اور یہ شعر اس مجموعۂ اردو میں بھی انھوں نے برقرار رکھا ہے جسے انھوں نے "بے رنگ" کہا ہے یعنی دیوانِ غالبؔ اردو مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء۔ شعر اس دیوان کے ص ۵۱ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ (بے رنگ وہ خاکہ جس میں ابھی رنگ بھرنا باقی ہے) حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی قطعہ حقیقت کا آئینہ دار نہیں۔ بلکہ اسے غالبؔ کے ذہنی تناؤ کی پیداوار کہنا چاہیے۔ انھیں اپنے اُردو شعر پر بھی اتنا ہی ناز تھا جتنا کہ فارسی شعر پر، ورنہ وہ مستقلاً اُردو مقطع کو اپنے اُردو دیوان میں جگہ نہ دیتے۔

(۵۵)

دیوانِ غالبؔ - پہلا ایڈیشن - اکتوبر ۱۸۴۱ء ص ۵۱

ے یہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ اسے سنا کہ یوں

غالبؔ نے دس بارہ سال پہلے یعنی ۱۸۲۱ء کے آس پاس مصرعۂ ثانی یوں لکھا تھا

ے شعرِ اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں،

اور جب ۱۸۳۳ء میں دیوانِ غالبؔ کے پہلے ایڈیشن کی پہلی روایت تیار ہوئی تو اس میں مقطع کے مصرعۂ ثانی کو بدل کر متبادل مصرع "گفتۂ غالبؔ ایک بار..." کر دیا اور پھر یہ اسی ترمیم کے ساتھ، جس سے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑا، اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد (اکتوبر ۱۸۴۱ء کے بعد اور ۱۸۴۵ء سے پہلے) غالبؔ نے اپنا مشہور فارسی قطعہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے ے

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

میں پہلے انھیں اوراق میں[*] لکھ چکا ہوں کہ غالبؔ کا یہ فارسی قطعہ ان کے ذہنی تناؤ

کی وجہ سے وجود میں آیا نہ کہ اس سبب سے کہ وہ اپنے اردو کلام کو فارسی کلام سے کمتر درجے کا سمجھتے تھے۔ تاہم پروفیسر وزیر الحسن عابدی بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں[1]۔ فرماتے ہیں۔

"...... پہلے یہ طے کرنا ہو گا کہ رشکِ فارسی سے کیا مراد ہے؟ خود غالبؔ کا اپنا فارسی کلام یا فارسی شعراء کا کلام؟" پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"غرض رشکِ فارسی میں فارسی کا اشارہ نہ غالبؔ کے اپنے فارسی کلام کی طرف ہے، نہ فارسی شاعری اور نہ فارسی شعراء کے کلام کی طرف، دراصل اس میں ایک تحقیقی اشارہ ہے جس کا تعلق اس غزل کے پس منظر سے ہے ......

گیارہویں صدی ہجری میں اصفہان کے ایک مشہور شاعر نواب باقر نے ایک نئی زمین نکالی تھی (کل شعر ۳۱ ہیں) ...... ؎

ہر کہ زحُسن پرُسدت دل بہ رُبا کہ ہم چنیں
وانکہ زناز گویدت عشوہ نما کہ ہم چنیں

.... نعمت خاں عالیؔ شیرازی [اورنگ زیب کے عہد کا شاعر رضا] نے ...... ایک مختصر مگر لطیف غزل کہی ...... غالبؔ کے زمانے میں اس کا اور بھی زیادہ چرچا رہا ہو گا ؎ (کل سات شعر)

ہر کہ غنچہ دم زند لب بکشا کہ ہم چنیں
ہر کہ زگل سخن کند رُخ بہ نما کہ ہم چنیں

.... رتن سنگھ زخمیؔ کے دیوان میں بھی اس زمین کی غزل ملتی ہے[2] .... اسی فارسی

---

[1] ادب لطیف لاہور۔ غالبؔ نمبر (جلد ۶۹ شمارہ ۱۱/۱۲ ص ۶۵)

(حاشیہ ۲ ص ۱۱۶ پر دیکھیے)

زمین کو غالب نے پوری کامیابی سے اُردو میں ڈھالا
...... غرض یہ مقطع کہتے وقت غالب کے ذہن میں
صرف یہی فارسی غزلیں تھیں جو اس زمین میں کہی گئی تھیں
..... بلکہ نعمت خان عالی کی غزل خاص طور پر ان کے
منظر میں ہو گی"

جب عابدی صاحب نے اسی زمین میں غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی غزل دیکھی تو اس کا جواز بھی انھیں ڈھونڈنا پڑا اور وہ مل بھی گیا۔ رقم طراز ہیں۔

" غالب کے اپنے قریبی ماحول میں اُن کے خسر نواب الٰہی بخش
خاں معروف کے دیوان کی غزل اس زمین میں ہے جو اس کا
مزید ثبوت ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس غزل کے لیے فکری
تحریک میں معروف کی بھی شرکت ہو اور چونکہ معروف کی غزل اس
زمین کی فارسی غزلوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کرتی، خاص طور
سے نعمت خاں عالی کی غزل کا، اس لیے غالب کو اپنی غزل
میں یہ اشارہ کرنا پڑا ...... ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی"

اس کے بعد معروف کی غزل درج کی ہے جس کے گیارہ اشعار ہیں دو مطلع ہیں ۔

" کیونکہ ہم ہوں مہر و مہ پوچھیں تو مت بتا کہ یوں
جب شبِ مہ ہو مہر وش منہ سے نقاب اٹھا کہ یوں
کوندے ہے برق کس طرح پوچھیں تو مت بتا کہ یوں
منہ کو چھپا کے کھول دے، کھول کے پھر چھپا کہ یوں "

(صہ ۱۱۵ کا حاشیہ) میرے پاس زخمی کا چھپا ہوا ضخیم دیوان موجود ہے (تاریخ طباعت ۱۲ ستمبر ۱۸۴۷ء۔ زخمی متوفی ۵۱/۱۸۵۰ء)۔ اس میں این چنیں اور ہم چناں کی ردیف ملتی ہے مگر ہم چنیں کی نہیں ۔ وزن بھی وہ نہیں جو باقر اور عالی کی غزلوں کا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عابدی صاحب اس غزل کا کوئی شعر درج نہ کر سکے، کیونکہ اس کا وجود ہی نہیں ۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف (متوفی ۱۸۲۶ء) کا مکمل قلمی دیوان میرے کتب خانے میں موجود ہے جو ۱۷ دسمبر ۱۸۳۰ء کو لکھا گیا تھا اس میں اس غزل کے ۱۴ شعر متن میں درج ہیں اور ان گیارہ اشعار میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ مندرجہ بالا بیانات میں سے وزیر الحسن عابدی صاحب کی ایک ہی بات قابلِ قبول ہے باقی سب من گھڑت ہے۔ وہ یہ کہ اُردو کو یہ زمین فارسی زمین کی دین ہے مگر اسے اُردو میں ڈھالنے والے پہلے شاعر غالب نہیں ہیں اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ زمین شاہ نصیر کی بنا کردہ ہے۔

صاحبِ طبقاتِ سخن مؤلفہ ۱۲۲۲ھ [۸-۱۸۰۷ء] کی روایت ہے کہ ایک بار شاہ نصیر میرٹھ آئے تھے اور یہاں کے شاعروں کو یہ مصرع طرح دیا تھا "غزلیں کہو کہ "کم دے چمن میں تو زرابندِ قبا کو وا کہ یوں" لیکن اس پر کسی نے غزل نہ کہی اس پر میاں نصیر کشیدہ خاطر ہوئے کہ میری فرمائش کی کوئی تعمیل نہ کر سکا۔ میاں روشن شاہ کو یہ ناپسند ہوا اور اس پر دو غزلہ کہہ ڈالا۔ پہلی غزل کا مطلع یہ تھا ؎

ہوتی ہے کس طرح سحر، بولے نقاب اُٹھا کہ یوں
شام کے حق میں کچھ کہو، منہ کو چھپا کہا کہ یوں

اس سے ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ۲۲/۱۸۲۱ء سے بہت پہلے کا ہے۔ شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ تھے اور یہ زمین جو فارسی زمین کا ہو بہو چربہ ہے عین ان کے مزاج کے موافق تھی۔ چنانچہ میرٹھ اور دہلی کے شاعروں نے غزلیں کہی ہوں یا نہ کہی ہوں شاہ نصیر اور ان کے شاگرد معروف نے اور بعد ازاں غالب نے (جن کو دلی زبان میں شاہ نصیر کا شاگرد بھی کہہ دیا جاتا ہے) غزلیں کہیں جو محفوظ رہ گئیں، غالب نے پہلے صرف چھ شعر کہے تھے اور چار بعد میں اضافہ کیے۔ شاہ نصیر کی نامکمل غزل ان کے دیوان "چمنستانِ سخن" (مطبوعہ ۱۳۱۴ مطابق ۱۸۹۷ء/۱۸۹۶ء — ص ۱۴۳) میں موجود ہے کل شعر چھے ہیں۔ دو شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

اُٹھتی گھٹا ہے کس طرح، بولے وہ زلف اُٹھا کہ یوں
برق چمکتی کیوں کے ہے، ہنس کے یہ پھر کہا کہ یوں

جیسے کہا کہ عاشقاں رہتے ہیں کیونکے چاک جیب
اس کو گلِ چمن دکھا، کہہ کے چلی صبا کہ یوں

شاہ نصیرؔ، ناسخؔ کی طرح جاندار استعاروں کو بھی بے جان بنا کر رکھ دیتے ہیں معروف سطحیت سے اوپر اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کے مقابلے میں کم عمری کے باوجود جب غالب اپنی غزل کہتے ہیں تو اپنا مخصوص رنگ دکھا جاتے ہیں ۔ آخری چار شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد ہے
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اب مقطع کے معنی آپ خود نکال لیجیے ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

(کیونکہ) کیونکے یعنی کیونکر پرانی زبان ہے ۔ یہ اس زمانے میں ابھی رائج تھا۔ اس لیے تینوں کے یہاں موجود ہے وزیر الحسن عابدی صاحب فرماتے ہیں کہ

"........ گیارہویں صدی ہجری میں اصفہان کے ایک مشہور شاعر نواب باقر نے ایک نئی زمین نکالی تھی ۔۔۔ ہر کہ زحسن پر سدت دل بہ ربا کہ ہم چنیں"

مگر یہ زمین تو گیارہویں صدی کے ایک اور مشہور شاعر کے یہاں بھی موجود ہے ۔ مرزا جلال اسیرؔ، جن کا کچھ نہ کچھ اثر غالبؔ نے اپنی ابتدائی شاعری میں قبول کیا معلوم ہوتا ہے، ۱۰۷۹ھ میں فوت ہوئے ۔ ان کے دیوان میں یہ زمین شامل ہے ۔ مطلع ہے ؎

شوق تو شد دو چار من گفت بیا کہ ہم چنیں
کردم اندہ سوال دل از رفت ز جا کہ ہم چنیں

اب حتمی طور پر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمین باقر اصفہانی ہی نے نکالی تھی۔ ہو سکتا ہے ان سے پہلے کے شاعروں میں سے کسی نے نکالی ہو۔

پھر عابدی صاحب یہ کیونکر کہتے ہیں کہ نعمت خاں عالی کی غزل کا جو، اس زمین میں ہے، غالب کے زمانے میں اور بھی زیادہ چرچا رہا ہو گا۔ عالی کا انتقال ۱۷۰۹ء میں ہوا۔ گویا باقر اصفہانی، اسیر اور عالی تقریباً ہم عصر تھے، عالی اسیر سے صرف تیئس سال بعد مرے اور قیاس چاہتا ہے کہ اسیر اور باقر تقریباً ہم عمر ہوں گے۔ ایسی حالت میں اس زمین کی بدولت یا تو چرچا کسی ایک کا بھی نہیں ہوا ہو گا یا پھر تینوں کا ہوا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعری زمین کا کوئی خاص چرچا ہوا ہی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو بیدل جو بے حد پُرگو شاعر تھا اور اس کا انتقال ۱۷۲۰ء میں ہوا۔ اس زمین میں طبع آزمائی کیے بغیر نہ رہتا۔

عالی کے انتقال کے اٹھاسی سال بعد غالب کا جنم ہوا۔ اس لمبے عرصے میں مرزا ہر گوپال تفتہ شاگرد غالب کے سوائے شاید ہی کوئی فارسی گو ہو گا جس نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہو۔ تفتہ کے اس زمین کے اپنانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسیر کی تمام زمینوں میں غزلیں کہہ کر الگ سے ایک دیوان ترتیب دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ کام پہلے دیوان کی اشاعت (۱۸۴۹ء) کے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے دوسرے دیوان مطبوعہ ۱۸۵۷ء میں ان کی تین غزلیں اسی زمین میں ملتی ہیں اور حاشیے میں اشارہ موجود ہے کہ یہ کلام اسیر کی غزل کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے۔ اگر پہلی غزل کے مطلع کو اسیر کے مطلع سے ملا کر دیکھیں تو بھی یہی ظاہر ہو گا ؎

آمد و حیلہ در پے اش گفت بیا کہ ہم چنیں
رفت چو ذکرِ صبرِ ما رفت ز جا کہ ہم چنیں

اب تفتہ کی تیسری غزل کا مقطع بھی ملاحظہ فرمایئے، جو معنی خیز ہے ؎

تفتہ تُوئی کہ شعر نغز از تو چکید ہم چناں
ورنہ بہ ردیفِ ایں غزل بود بلا کہ ہم چنیں

ضمیمہ: اب تذکرہ طبقاتِ سخن (۱۹۹۱ء میں) مسز تسیم اقتدار علی نے مرتب کر کے شایع کر دیا ہے۔ اس کے ص ۱۷۰/۱۷۱ پر درج ہے:

نصیرؔ میاں کلّو

"بعد چند سال از تحریرِ ایں تذکرہ کہ آں عزیز پُر تمیز بیقریب وصول زر سالیانہ بہ درگاہ میر ممدوح از سرکار صاحب کلکٹر در میرٹھ ------ آمد۔ از مؤلف ہم ملاقات نمود چنانچہ ------ در غریب خانہ بزمِ مراختہ مرتب بود۔ مؤلف قصیدۂ خود را کہ ------ در آں جلسہ خواند ------ ہر کہ متحضر بود خوش و خرّم شد۔ آں کس سکوت ماند۔ بعد فراغ از مراختہ مصرعہ بخواند۔ سوال طرحِ غزلش ساخت ہر چند مصرعہ مذکور دو قتے خواشت ------"

(پوری عبارت اس طرح تحریر کی گئی ہے کہ کئی جگہ پڑھا نہیں جاتا۔ حاصل تحریر یہ ہے کہ مذکورہ بزم مراختہ کے بعد میاں نصیرؔ نے ایک مصرعہ پڑھا:

"کر دے چمن میں تو ذرا بندِ قبا کو وا کہ یوں" اور اس پر غزل کہنے کی فرمائش کی۔ لیکن اسوقت کسی نے اس مصرع پر غزل نہیں کہی۔ اس پر میاں نصیرؔ مولف

سے کشیدہ خاطر ہو گئے اور سب سے شکایت کرنے لگے کہ میری فرمائش کی کوئی تعمیل نہ کر سکا۔ میاں روشن شاہ کو یہ دعوے ناپسند ہوا اور انھوں نے اُس مصرع پر ایک دو غزلہ کہہ ڈالا۔ پہلی غزل کا مطلع ہے :

ہوتی ہے کس طرح سحر، بولے نقاب اُٹھا کر یوں
شام کے حق میں کچھ کہو، منھ کو چھپا، کہا کہ یوں

(ص ۳۵۰ — ۳۴۸)

(۵۶)

ریاض صابر (دیوان مرزا محمد قادر بخش مرحوم دہلوی) مطبوعہ ۱۳۰۰ھ

ص ۵ (دیباچہ) پر سید محمد سلطان عاقل دہلوی شاگرد صابر اور مرتب دیوان لکھتے ہیں۔

...... استادی مرزا محمد قادر بخش صابر دہلوی شاہزادہ تیموری گورگانی...... ۱۲۲۳ ہجری نبوی میں شاہجہاں آباد کے قلعہ معلیٰ میں...... پیدا ہوئے...... پہلے حضرت عبدالرحمٰن خاں احسان (اور) ان کے انتقال کے بعد...... امام بخش صہبائی سے فیض پایا۔ غالب و مومن و ذوق سے ہمعصرانہ ربط رہا۔ چنانچہ پانچ شعر کے ایک قطعہ میں فخریہ فرماتے ہیں ؎

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و مجنوں
ہوئی احسان سے پُر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض
طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری

اور ہم بزم رہے مومنؔ و ذوقؔ و غالبؔ
اور استادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد صابرؔ بنارس چلے گئے تھے۔ اس لیے قطعے کے آخر میں فرماتے ہیں ؎

"باہر آ کر نہیں مشہور ہوا میں کچھ آج
شکر ہے اپنی ہی دلّی سے ہے شہرت میری"

بنارس ہی میں ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ عاقل مؤلف دیوان (ریاض صابرؔ) نے محمد قادر بخش سے تاریخ نکالی۔
۱۲۹۹ھ

ص ۷ (دیباچہ) ایک تذکرہ گلستانِ سخن جو در حقیقت رنگینیٔ عبارت میں گلستانِ سخن ہے۔ غدر کے پہلے کی طبع آزمائی ہے۔"

بعض مشاہیر اس بات پر مصر ہیں کہ یہ تذکرہ حقیقت میں صابرؔ کا تالیف کردہ نہیں ہے بلکہ ان کے استاد صہبائیؔ کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ صابرؔ ہی کا مؤلفہ ہے۔ اور جیسا کہ خود صابرؔ نے اقرار کیا ہے صرف صہبائیؔ کی اصلاح سے مزیّن ہے۔ اگر چہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تذکرے میں شامل علمی بحثیں صہبائی ہی کے قلم سے ہوں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ غالبؔ اور صہبائیؔ میں باہمی ربطِ طبیعت نہ تھا غالباً یہی وجہ ہے کہ جب صہبائیؔ نے ۱۸۴۴ء میں "انتخابِ دواوین" شائع کی، جن میں کل ۱۲ شاعر شامل ہیں، ان میں ذوقؔ اور مومنؔ کو تو شامل کیا مگر غالبؔ کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ اس وقت غالبؔ کی عمر ۴۵ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور ان کا اردو دیوان شائع ہو چکا تھا۔

گلستانِ سخن تقریباً ۱۸۵۵ء میں چھپی اگر صہبائیؔ اس کے مؤلف ہوتے تو اس میں ایک بار پھر غالبؔ نظر انداز کر دیے جاتے۔ مگر یہاں تو صابرؔ نے بہت سی تعریف و توصیف کے بعد لکھا ہے کہ "غالبؔ غالب اور ہر طالب اسی نام سے ہند خارس میں اسی کے نشان کا طالب ہے"، پھر انتخاب میں غالبؔ کے ۳۲ شعر اردو کے اور ۲۹ شعر فارسی کے دیے ہیں۔

(۵۷)

سفینہ (دو ماہی)، شمارہ مئی / اگست ۱۹۸۷ء۔ مدیر عطا کاکوی، ص ۱۷

غالبؔ سے متعلق ایک لطیفہ عبدالغفور نساخؔ نے سخنِ شعراء کے علاوہ ایک اور تذکرہ فارسی کے معاصرین شعراء کا بنام تذکرہ معاصرین لکھا تھا جو نا تمام رہا۔ اس کے چند اجزا حرف عین تک چھپے تھے۔ اب نہ مخطوطہ کا پتا ہے اور نہ مطبوعہ اجزا کا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ نسخہ کی ایک نقل در نقل عکسی دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں نساخؔ نے یہ بیان کیا ہے کہ سنا ہے جب حضرتِ غالبؔ کلکتہ تشریف لائے تو اس موقع پر ایک مشاعرہ فارسی کا منعقد ہوا۔ جس میں نساخؔ کے ایک پھوپھی زاد حفیظ الدین شہیدؔ بھی شریک تھے، ابھی کم سن بھی تھے مگر بڑے طبّاع اور حاضر جواب تھے۔ جب انھوں نے مقطع پڑھا جس میں لفظ شہیدؔ تھا تو غالبؔ کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انھوں نے پوچھا "ارے بابا آپ شہیدؔ کب سے ہو گئے؟" شہیدؔ نے برجستہ جواب دیا کہ "جب سے کافر غالبؔ آئے۔" غالبؔ اس جواب سے اتنے محظوظ ہوئے کہ شہیدؔ کو اپنے پاس بلا کر پہلو میں بٹھایا اور حاضر جوابی کی خوب داد دی۔ نساخؔ کی پیدائش ۱۲۴۹ھ کی ہے اور غالبؔ ۱۲۴۳ھ کے لگ بھگ کلکتہ گئے تھے۔ یہ واقعہ ان (نساخؔ) کے سامنے کا نہیں۔ انھوں نے سنا ہوگا۔ شہیدؔ کا سالِ ولادت یا عمر کا کوئی

تخمینہ معلوم نہیں ۔ وفات ۱۲۵۴ھ میں ہوئی ہے معلوم
نہیں اس واقعہ کے وقت شہید کی عمر کیا تھی؟ نساخ کا
تذکرہ سخن شعراء ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہوا تھا ۔ اس میں
حفیظ الدین شہید کا ترجمہ (ص ۲۶۰) شامل ہے جو ذیل
میں درج کیا جاتا ہے ۔

"شہید تخلص مولوی حفیظ الدین مرحوم سابق ڈگری نویس
عدالت صدر دیوانی کلکتہ، خلف منشی نجم الدین مرحوم منصف بردوان
شاگرد لالہ کھیم نرائن رند باشندۂ ضلع فرید پور متعلق ڈھاکہ راقم
(نساخ) کے پھوپھی زاد بھائی تھے ۔ اشعارِ فارسی ان کے
نہایت نمکین و شیریں ہوتے ہیں ۔ چوبیس پچیس برس کا
عرصہ ہوا کہ انتقال کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شہید کا انتقال ۱۲۵۴ھ کے قریب ہوا ہوگا اور
اس وقت غالب سے پیش آئے واقعے کو کم از دس سال ضرور ہو چکے
ہوں گے ۔

نساخ نے شہید کو مولوی حفیظ الدین شہید لکھا ۔ اس سے
ظاہر ہے کہ شہید انتقال کے وقت ۳۰ سال کے پیٹے
میں ضرور ہونگے اور غالب والے واقعے کے وقت
تقریباً ۲۰ سال کے ۔ انھیں اس وقت اگر کمسن
کے بجائے نوجوان کہا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا ۔

دوماہی 'سفینہ'، شمارہ ۲۷، ۲۸ جنوری / اپریل ۱۹۸۷ء جو تذکرۃ المعاصرین کا اردو ترجمہ
ہے، کسی وجہ سے دیر سے طبع ہوا ۔ اس میں شہید کا ترجمہ یہ ہے ۔

شہید راقم کے پھوپھی زاد بھائی مولوی حفیظ الدین مرحوم
ڈگری نویس عدالت عالیہ صدر دیوانی کلکتہ ولد سید
نجم الدین مغفور منصف بردوان ۔ منشی سید نعمت اللہ

خاں بہادر۔ صدر الصدور ضلع جیسور کے بڑے بھائی
اور شاگرد لالہ کھیم نرائن رِند دہلوی۔ بلند فکر اور ارجمند
طبع رکھتے تھے۔ ایک ضخیم دیوان مرتّب کیا تھا۔ جو چوری
ہوگیا ۱۲۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ راقم نے تاریخِ وفات کہی۔

حیف افسوس صد ہزار افسوس — رفت چوں از جہاں حفیظ الدین
سالِ ترحیل او ز روئے حساب — شد ہمائے جناں حفیظ الدین (شعر)

نقل ہے کہ جس زمانے میں نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ
خاں بہادر نظام جنگ عرف مرزا نوشہ غالبؔ دہلوی کلکتہ
آئے ہوئے تھے۔ ایک دن بزم مشاعرہ میں جب کہ
خود مرزا غالبؔ بھی تشریف فرما تھے۔ شہید جو ابھی
کم سن اور ذکی حاضر جواب تھے، نے اپنی غزل سنانی
شروع کی جب مقطع سُنایا جس میں شہیدؔ تخلّص تھا تو
غالبؔ نے ان سے پوچھا کہ بابا تم شہیدؔ کب ہوگئے۔
شہیدؔ نے برجستہ جواب دیا قبلہ جس روز سے کہ کافر غالبؔ
ہوگئے۔ غالبؔ نے ان کو شاباش اور زندہ باش کہتے
ہوئے اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔

(۵۸)

دیوانِ غالبؔ۔ پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۴۱ء۔ ص ۵۶

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

عموماً کہا جاتا ہے کہ غالبؔ نے اس شعر کا مرکزی خیال بیدلؔ کے ذیل کے شعر سے لے کر نظم کیا ہے۔

مطلبم از می پرستی تر دماغی ہا نہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

میرے خیال میں یہ شعر خیامؔ کی رباعی کے دوسرے شعر سے زیادہ مشابہ ہے ؎

خواہم کہ بہ بے خودی بر آرم نفسے
مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

پوری رُباعی ملاحظہ فرمائیے ؎

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است
نے بہر فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بے خودی بر آرم نفسے
مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

غالبؔ یہ شعر اپنی ۲۴ سال کی عمر سے پہلے کہہ چکے تھے۔

(۵۹)

دیوانِ غالبؔ ۔ دوسرا ایڈیشن ۔ ۱۸۴۷ء

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں ؎
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیا یہ شعر خیامؔ کی اس رباعی سے ماخوذ ہے؟ ؎

افسوس کہ در حساب خواہند نہاد
عمرے کہ مرا بے مے و معشوق گذشت

پوری رباعی اس طرح ہے ؎

تا باز شنا ختم من از پاے ز دست
این چرخ فرو مایہ مرا دست بہ بست
افسوس کہ در حساب خواہند نہاد
عمرے کہ مرا بے مے و معشوق گزشت

(۶۰)

دیوانِ غالبؔ تیسرا ایڈیشن، مطبع احمدی ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ ص ۲۰

؎ بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر"

اس شعر کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جناب مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم ہفتہ وار ہماری زبان کے یکم جولائی ۱۹۶۲ء کے شمارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ان (غالبؔ) کی یہ گراں گوشی بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان سے باتیں کرنے کے لیے قلم کی زبان سے کام لینا پڑتا تھا۔ سیّد آل محمد بلگرامی ثم مارہروی کے ایک قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کا یہ ثقلِ سماعت کب اور کیونکر عارض ہوا۔ وہ قطعہ اور اس کے عنوان کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"تاریخ کر شدن مرزا اسد اللہ خاں المتخلص
بہ غالبؔ والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ
بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے
دوستو تاریخ اس کی غیب سے
یہ سنی میں نے کہ غالبؔ کر ہوئے"

سنہ ۱۲۸۴ھ

یہ قطعہ منصف کے دیوانِ تواریخ (صفحہ ۱۶۴) میں شامل ہے
جو مطبع نور الانوار آرہ ضلع شاہ آباد سے ۱۲۹۵ھ میں
شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانے
میں موجود ہے ۔۔۔۔۔۔"

اس کے جواب میں جناب امتیاز علی عرشی مرحوم ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء کے ہماری زبان میں اپنا وہ طویل بیان پیش کرتے ہیں جو انھوں نے مکاتیبِ غالب (طبعِ چہارم) ۱۹۴۶ء۔ ص ۱۵۹ تا ۱۶۱ میں شائع کیا تھا۔ لکھا ہے۔

"آل محمد مارہروی نے دیوانِ تواریخ ص ۱۶۴، میں ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے "تاریخ کر شدن مرزا اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی" خود قطعہ یہ ہے:

بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے	کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ
یوں کہی میں نے کہ "غالب کر ہوئے"	دوستو تاریخ اسکی غیب سے

اس مادۂ تاریخ سے اعداد ۱۲۷۴ نکلتے ہیں جو سال ہجری ہے اور ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء تا ۱۰ اگست ۱۸۵۸ء سے تطابق رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آئندہ عرض کروں گا، یہ تاریخ ایک غلط فہمی کی بناء پر نکالی گئی ہے۔ دراصل میرزا صاحب اس بات سے برسوں پہلے بہرے ہو چکے تھے، چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو تفتہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں۔ "بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرہ ہو گیا ہوں،"

(اردوی: ۱۱۳) یک شنبہ ۱۹ دسمبر سنہ ء بالا کو منشی نبی بخش کے خط میں جن کی بینائی میں ضعف آگیا تھا، لکھتے ہیں کہ کاروانِ مارا ہمیں شنیدن و دیدن و گفتن و رفتن متاع است، چرا بتاراج نرود۔ یکے را گوش گرانست،

تا ہمنشیں چہ سراید ؛ یکے را چشم نگراست تا کہ می آید"۔
(باغِ دو در : ۱۶۱ الف) یہ بہرے ہونے کی تاریخ سے متعلق ان کے قطعی اور تفریحی بیانات ہیں۔ لیکن ہم اس تاریخ کو اور پیچھے لے جا سکتے ہیں۔ ایک فارسی خط میں شفق کو تحریر کیا ہے "اکنون کہ دندان فرو ریخت، و گوش گراں گشت موے سپید است در دی پُر آژنگ دست بلرزہ اندر است، و پاے در رکاب" (پنج آہنگ: ۴۴۸، طبع دوم) اس خط میں جواں بخت کے سہرے کا قضیہ دہرایا ہے۔ میرزا صاحب کا سہرا، ذوق کا جواب اور میرزا صاحب کی معذرت، یہ سب دہلی اردو اخبار ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۸ھ (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ غالبًا اس اخبار کو پڑھ کر شفق نے استفسار حال کیا، اور یہ سب کچھ اس واقعہ کے فورًا بعد پیش آیا، اس لیے کہ میرزا صاحب نے بیانِ واقعہ سے پہلے لکھا ہے، "تا دیدہ وراں از دور بنگرند کہ نامہ نگار را مژہ خون فشانست و دلِ دردمند" ظاہر ہے کہ دل کی دردمندی اور مژہ کی خون فشانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔ اور کچھ ہو بھی، تو اتنی تو یقینًا نہ ہوگی کہ اُسے ایسے پُر درد انداز سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا میرزا صاحب کو ۱۸۵۲ء کے آخر کی بجائے اب آغاز میں بہرہ ہونا چاہیے۔

سرور کے خط میں فرماتے ہیں، "میں پانچ سات برس سے بہرہ ہو گیا ہوں" (عود ہندی ص ۱۱) یہ خط ان کے نام کے خطوں میں دوسرا ہے، اور تیسرا خط پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا تھا اس بنا پر اسے بھی ۱۸۵۸ء ہی کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر میرزا صاحب کے اس تخمینے کے پیشِ نظر انھیں ۱۸۵۱ء میں بھی ثقلِ سماعت کا مریض ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب ایک فارسی قصیدے میں، جو واجد علی شاہ کی مدح میں ہے اور کلیات (ص ۳۲۱) میں چھپ چکا ہے، فرماتے ہیں۔

فغاں ز پیری و رنجوری و گرانیِ گوش
کہ کرد ایں ہمہ دشوار، کارِ آساں را

یہ قصیدہ واجد علی شاہ کے مدحیہ قصیدوں میں دوسرا ہے، تیسرا قصیدہ لکھنؤ کی کربلائے معلّے میں تزک و احتشام کے ساتھ ضریح لے جانے سے متعلّق ہے، ضریح کا واقعہ تاریخِ اودھ (۲/۱۰۰) کے مطابق پنجشنبہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ (۲۵ مئی ۱۸۵۴ء) کو پیش آیا تھا۔ لہٰذا میرزا صاحب نے قصیدہ ۱۸۵۴ء ہی میں لکھا ہوگا، پہلے قصیدے کی تاریخ ابھی تک متعین نہیں ہو سکی ہے۔ دوسرا قصیدہ میری رائے میں ۱۸۴۹ء کے آخر میں لکھا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں۔

کہ گفتہ است در آئینِ بزم سور و سرور
کہ فرخی بود در دز ہائے آباں را

من از درازیِ شبہائے قوس پندارم
کہ بہرِ انجمن آرد فلک زمستاں را

خوشا درازیِ شب زانکہ گر بود تاریک
درنگ در نظر افزوں بود چراغاں را

وگر بود شبِ مہ نیز بزم عیش آرای
بحصہ دیر نگہدار ماہِ تاباں را

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت ماہِ آباں کی راتیں تھیں، اور آفتاب برج قوس میں براجمان تھا، آباں ایرانی سال کا آٹھواں مہینہ ہے اور انگریزی مہینوں میں سے نومبر کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، پنج آہنگ (ص ۲۱۲) طبع ثانی میں میرزا صاحب کا ایک خط میرزا حیدر کے نام ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ "در سر آغاز سال گر یختہ در مدح ۔۔۔ سلطان عالم

(واجد علی شاہ) قصیدۂ انشاد کردم۔ عرضداشتی در نثر نیز رقم زدم و آں قصیدہ و عرضداشت بہ قطب الدولہ فرستادم، قطب الدولہ مردمی کرد و قصیدہ عرضداشت بنظر جہان بان دارا دربان درآورد، ..... پسندیدۂ طبع بلند شہریار افتاد و بر قطب الدولہ فرمان رفت کہ بہنگام دگر عرضداشت را دوبارہ بنظر گزراند..... ناگاہ انجمن برہم خورد کار قطب الدولہ از پر کار افتاد، بےچارہ آں قصیدہ و آں عرضداشت راہم چناں بسوے من برگرداند" اس کے بعد مرزا حیدر سے درخواست کی ہے کہ آپ اس قصیدے اور عرضداشت کو پیش کرکے صلہ دلائیے۔

قطب الدولہ کے اخراج کا واقعہ تاریخ اودھ (ج ۲ ص ۸۵) کے مطابق یک شنبہ ۲ رجب ۱۲۶۶ھ (۲ جون ۱۸۵۰ء) کو پیش آیا تھا، میرے نزدیک یہی قصیدۂ دوم تھا، جو قطب الدولہ کی معرفت پیش ہوا تھا۔ اس لیے کہ مرزا صاحب نے آغاز سال گذشتہ میں اس کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جو قصیدہ جنوری میں بھیجا جائے گا، وہ نومبر اور دسمبر ہی میں لکھا جانا چاہیے۔

ان دلائل کے ثابت ہو جانے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب اس کے لکھتے وقت بہرے تھے، اور چونکہ وہ نومبر ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا ہے، لہٰذا آخر سنہ مذکور میں انھیں اس مرض میں مبتلا ہونا چاہیے۔

مرزا صاحب نے ایک..... فارسی قصیدہ آزردہ کی مدح میں لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں۔

نالم از درد دل، امّا چارہ چوں خواہم زکس
من کہ نتواند بگوشِ من رسد آدای من

اس شعر میں اپنے ضعف کا بمبالغہ بیان مقصود ہے، یعنی میرا حال کمزوری سے یہ ہوگیا ہے کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی، یا نکلتی ہے تو بے حد پست، حتیٰ کہ میں خود اسے نہیں سُن سکتا پھر ایسی حالت میں کسی سے کیا اعانت کی امید رکھوں، وہ میری کب سُن سکے گا جو مدد کو آگے بڑھے مگر میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب نے یہ مضمون اپنے بہرے پن کی حالت سے پیدا کیا ہو تو کچھ بعید نہیں اگر یہ خدشہ درست ہے، تو انھیں ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے قبل سے بہرہ ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ قصیدہ سن مذکورہ کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہونے کے باعث اس سے پہلے لکھا ہوا ہے۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ مرزا صاحب ۱۸۵۲ء میں بالیقین بہرے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں گمان غالب ہے کہ بہرے ہوں اور ۱۸۴۵ء میں ان کے بہرے ہونے کا احتمال ہے۔ آل محمد مارہروی کو یوں غلط فہمی ہوئی کہ مرزا صاحب نے ستر ہ کے ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ " اگرچہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرہ ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں " (عود: ۱۳) اس سے مرزا صاحب کا مقصد صرف یہ تھا گو بہرہ ہوں، مگر اس بڑھاپے میں بھی نگاہ تیز ہے، آل محمد صاحب یہ سمجھے کہ ۶۳ برس کی عمر میں بہرہ پن شروع ہوا ـــ "

یہاں تک تو مسئلہ تھا غالب کے ثقلِ سماعت کی تاریخ کا۔
اب سوال یہ ہے کہ اس شعر میں "بہرہ ہوں میں ۔۔۔۔۔۔" کا زمانہ فکر کیا ہے کیونکہ اس کا بھی غالب کے ثقلِ سماعت سے قریبی تعلق ہے میرے غالب کلکشن میں دیوانِ غالب دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۷ء کا ایک نسخہ وہ ہے

جس کے آخر میں کسی نے غالبؔ کا بہت سے کلام درج کر دیا ہے جو اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا تھا وہ غزل جس میں یہ شعر ہے، بھی اُسی کلام میں درج ہے اب جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ بگمانِ غالبؔ، مرزا صاحب ۱۸۴۹ء تک بہرے ہو چکے تھے اور یہ شعر ۱۸۴۷ء کے بعد کہا گیا تھا تو اس کا زمانۂ فکر ۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۹ء میں ہو سکتا ہے اور قوی امکان ہے کہ غالبؔ اس عہد تک اتنے بہرے ہو چکے تھے کہ اُن تک پہنچانے کے لیے بات کو ایک سے زیادہ بار دہرانا پڑتا تھا۔

حمید احمد خاں مرحوم جنھوں نے عارفؔ کی بہو معظم زمانی بیگم عرف بگاّ بیگم سے جولائی ۱۹۳۸ء میں ملاقات کی تھی، فرماتے ہیں کہ جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا: "میں نے تو انہیں بہرا ہی دیکھا جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے"

گو بگاّ بیگم (ولادت ۱۸۵۲ء) کی شادی ۱۸۶۴ء میں ہوئی تاہم وہ اپنے والد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں اور غالبؔ کی دوستی کی وجہ سے غالبؔ کو بہت پہلے سے جانتی تھیں۔ لیکن غالبؔ کے بہرا ہونے کی اس سے قدیم تر شہادتیں اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔

(۶۱)

من کیستم؟ از مرزا محمّد عسکری۔ اتّر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء

ص ۲ پر "پیش لفظ" جناب محمّد رضا انصاری کے قلم سے ہے جس میں اور باتیں ہیں مگر یہ نہیں ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا تھا۔

تاہم اس کے ص ۶۰ پر مرزا عسکری مرحوم کی زبانی درج ہے کہ "اب وقتِ تحریر بطورِ ہٰذا ستمبر ۱۹۴۲ء ہے، تہتّرواں سال ہے"

اس میں ثاقبؔ لکھنوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کے بارے میں لکھا ہے۔

ص ۸ ۔۔۔۔۔۔۔ سفید داڑھی کی وجہ سے مرزا غالبؔ سے کچھ مشابہت پیدا ہوگئی ہے ۔ اسی سے مَیں آپ (ثاقبؔ) کو "عکسِ غالبؔ" کہتا ہوں جس سے آپ خوش ہوتے ہیں۔۔۔"

ڈاکٹر حنیف نقوی اپنے نانا منشی شاکر حسین نکہت مرحوم کا ایک تاریخی قطعہ درج کرتے ہیں جس کا پہلا شعر ہے۔

ثاقبِ روشن بیاں، ذاکر حسینِ نکتہ سنج
جانشینِ میرؔ و غالبؔ، صاحبِ فکر رسا[1]

"گفتارِ بیخود"[2]، کے صفحہ ۳۴۳ پر ایک قطعۂ تاریخ ثاقبؔ کا فکر کردہ بھی ہے جس کا عنوان یوں ہے

"قطعۂ تاریخ نوک ریزِ قلمِ فصاحت رقم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
جناب مرزا ذاکر حسین صاحب قزلباش لکھنوی المتخلّص بہ ثاقبؔ یادگار نواب اسد اللہ خاں غالبؔ ۔۔۔۔۔۔۔"

خدا معلوم ثاقبؔ لکھنوی کو "جانشین میرؔ و غالبؔ" اور بیخودؔ دہلوی کے عینِ حیات کس بنا پر "یادگار نواب اسد اللہ خاں غالبؔ" کہا گیا ہے؟

(ص ۱۰) "میرا نام محمد عسکری ہے ۔ میرے والد مرزا محمد تقی ابن محمد مرزا خاں (عرف مرزا خانی) ۔۔۔۔ تھے میری ولادت محلہ محمود نگر شہر لکھنؤ میں ۱۸۶۹ء میں اسی مکان میں ہوئی جس میں میری اب بھی سکونت ہے ۔ یہ میری پیدائش سے قبل میرے دادا مرزا خانی کا دیوان خانہ کہلاتا تھا۔ ۔۔۔۔ ۱۲۸۵ھ میں مرزا غالبؔ دہلوی نے رحلت فرمائی تھی۔

---

[1] تلاش و تعارف، ڈاکٹر حنیف نقوی ۔ ۱۹۸۷ء نصرت پبلشرز لکھنؤ صفحہ ۲۷۱
[2] گفتارِ بیخود ۔ بیخود دہلوی ۔ مطبوعہ جنوری ۱۹۳۸ء بارِ دوم ۔

(ص ۱۱) اور میری پیدائش اسی سال میں ہوئی ....
روحوں میں راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی ....
.... میری روح نے غالبؔ کی روح کو جھک کر
سلام کیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں
فارسی اور اردو زبانوں کا جامع شاعر غالبؔ کی
ٹکر کا کوئی گزرا ہی نہیں۔

(ص ۶۲) میرے والد مرزا محمدؔ تقی ...... قاضی محمد صادق
خاں اخترؔ (مصنّف۔ تذکرۂ آفتاب عالم تاب) کے
شاگرد تھے۔ یہ تذکرہ میرے یہاں تھا مگر
افسوس کہ اب کہیں پتا نہیں، والد فرماتے تھے
کہ قاضی صاحب مذکورہ اور ان کے بیشتر مرزا
قتیلؔ اسی مکان میں رہ چکے ہیں، جس میں میں
رہتا ہوں۔

(ص ۶۳) میرے دادا محمد مرزا خاں معروف بہ مرزا خانی
...... غالبؔ و شاہ نصیرؔ وغیرہ کے
دوست مرزا محمد حسن قتیلؔ کے شاگرد تھے۔
.... سر سیّد احمد خاں مرحوم جن سے میں
الٰہ آباد یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر ملا تھا
اور ان سے کہا کہ مرزا خانی میرے دادا تھے تو
فرمایا کہ وہ دلّی کے مشہور کوتوال تھے۔ میں نے
جوانی میں ان کو دیکھا تھا۔ ان کا تذکرہ ضمناً "آبِ
حیات" میں دو جگہ موجود ہے۔ ایک مرزا غالبؔ
کے ذکر میں یہ کہ مرزا کے عمدہ کلام کا انتخاب شروع
میں مولانا فضل حق اور مرزا خانی نے کیا تھا،

دوسرے شاہ نصیر کے حال میں یہ کہ شاہ صاحب
ایک مرتبہ چند غیر مقلد لوگوں کے نرغہ میں پھنس گئے تھے،
جب کوتوال کو خبر ہوئی جو اُن کے دوست تھے تو وہ چھڑا
لائے جس پر شاہ موصوف نے بطور شکریہ کے
ایک قصیدہ یا قطعہ ان کی تعریف میں کہا تھا اور یہ دو
شعر بھی دیئے ہیں

(ص ۶۳) ؎

ہرن کی طرح میدانِ دغا میں چوکڑی بھولے
نہ یاد آئی حدیث ان کو، نہ کوئی نصِ قرآنی
نصیر الدین بے چارہ تو رستم طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

..... جب ..... نواب شمس الدین خاں کو پھانسی
ہوئی تو مرزا خانی نہایت رنجیدہ اور بددل ہو کر نوکری
چھوڑ لکھنؤ چلے آئے کیونکہ ان سے نواب صاحب
مذکور سے بڑی دوستی تھی اور ان کی سزا کو ایک ظالمانہ
کارروائی سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں بزمانۂ نصیر الدین حیدر
و محمد علی شاہ وہ بعہدہ صدر الصدور فائز ہوئے اور
یہیں انتقال کیا۔

(ص ۱۷) ..... اب میرا سن تیرہ چودہ[1] کا ہوگا .....
کیننگ کالج دس بارہ برس پیشتر سے قائم تھا۔

---

[1] گویا یہ واقعہ ۸۳/۱۸۸۲ء کا ہوگا اور یقیناً دسمبر ۱۸۸۳ء سے پہلے
کا کیونکہ قدر نے ساڑھے سات برس کی ملازمت اسی ماہ پوری کی تھی۔
(قدر ولادت اکتوبر ۱۸۳۳ء وفات ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء)

(ص ۱۸) .... اچھے کپڑے پہن کر میں والد اور ایک بزرگ عزیز مرزا خداداد بیگ کے ساتھ نام لکھوانے کالج گیا۔ وہاں منشی غلام حسنین قدر بلگرامی سے مرزا صاحب موصوف سے ملاقات ہوئی۔ قدر مرحوم، اس زمانہ کے مشہور غالب کے شاگرد، کالج میں فارسی پڑھاتے تھے .... نہایت مختصر آدمی تھے۔ پستہ قد، سر پر پٹے نیچے بل کھاتے ہوئے، نہایت صاف کپڑے پہنے ہنس مکھ بامذاق بزرگ تھے۔

(ص ۴۹) مسٹر صلاح الدین مقدر بخش بیرسٹر .... مولوی خدا بخش خاں بانی خدا بخش لائبریری بانکی پور کے صاحبزادے میرے مکان (کلکتہ) کے بالکل متصل رہتے تھے۔ ان سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ میں ان کو غالب کا کلام ——————

(ص ۵۰) سناتا اور یہ جرمن شاعر ہینی (Heine) کے اشعار سناتے ...... لیکن میں .... غالب کی فضیلت ثابت کرتا ....

(ص ۵۹) .... اسی سال یا ۱۹۲۱ء میں راجہ محمود آباد .... (محمد امیر احمد خاں) ...... نے کہا کہ مجھ کو پڑھا دیا کیجیے ...... دیوانِ غالب شروع کیا ...... (انھوں نے) دیوانِ غالب کو ایسے شوق سے اور سمجھ داری سے پڑھا کہ ...... دیوانِ غالب عزیزِ جاں ہو گیا۔ وہ اس کو ہر وقت اپنے پاس رکھنے لگے ...... کسی ساعت جدا نہیں کرتے تھے۔ ۳۵ء (۱۹۳۵) میں جب نینی تال گورنر سے ملنے گئے

(میں بھی ساتھ گیا تھا) ۔۔۔۔۔۔

(ص ۶۰) میں نے پوچھا کہ گورنر سے ملاقات کے وقت بھی اس (دیوانِ غالب) نے رفاقت کی ۔ کہا جی ہاں ، نواب محمد یوسف کے یہاں دعوت کے موقع پر بھی اس کی جدائی گوارا نہ تھی ۔ غرض کہ یہ ایک عزیز و اکنگ اسٹک کی طرح ان کے ہاتھ میں رہتا تھا ۔ نوکر بھی اس کے لینے کا مجاز نہ تھا ۔ جب سے آپ مسلم لیگ کے سیاسی کاموں میں منہمک ہیں یہ بےچارہ غالب مغلوب ہو گیا ہے ۔۔۔۔"

(۶۲)

مکاتیبِ امیر مینائی ۔ از احسن اللہ خاں ثاقب ۔ جون ۱۹۶۴ء

(ص ۳۲) "مرزا غالب بھی کبھی کبھی آ کر مہینے دو دو مہینے نواب (رام پور) کے مہمان رہتے تھے ۔۔۔۔"

مرزا غالب دو مرتبہ رام پور گئے تھے ۔ پہلی بار قیامِ رام پور کا زمانہ ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء تا ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء ہے ۔ اور دوسری بار ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء تا ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء گویا پہلے قیام میں ۵۰ راتیں ، اور دوسری بار کے قیام میں ۷۷ راتیں انھوں نے رام پور میں گذاریں ۔ اس طرح کُل مدّت ۱۲۷ راتیں یا چار ماہ ۷ راتیں ہوئی ۔

(ص ۱۷) (امیر مینائی نے) فرمایا کہ ان (محسن کاکوروی) کا کلام ایک عالم ہے خیالاتِ نادرہ کا ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ حضرت محسن نے زمانۂ غدر سے پیشتر کاکوری میں مرزا بیدل ۔۔۔۔۔ کے کرم خوردہ کلام کو ترتیب دے کر جہاں جہاں کیڑا لگ گیا تھا ، ان مقامات پر اپنی فکر

صائب سے فقرے اور شعر ضم کیے تھے۔ اس طرح جب وہ
کل کلام درست فرما چکے تو شب کو مرزائے مرحوم (بیدل)
کو عالم رؤیا میں دیکھا ..... مرزائے مرحوم .... (نے)
فرمایا کہ یہ نظم ونثر اصل میں بھی اسی طرح تھی ـــــ "

اس بیان کی صداقت اور عدم صداقت کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے۔

(ص ۱۸) ایک وقت میں (ثاقب) نے استاد (امیر مینائی) سے
کہا، مرزا بیدل کے اکثر شعر سمجھ میں نہیں آتے۔ فرمایا کہ سچ ہے مگر یہ خوبی
بیدل ہی کے کلام میں ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اور اچھا معلوم ہوتا ہے "

امیر مینائی اور ثاقب کی یہ رائے بیدل کی مختصر بحروں پر عاید نہیں ہوتی جو عموماً رواں اور ہلکی پھلکی ہیں۔ (غالب کے ہاں بھی یہی عالم ہے)، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بحروں کی نسبت بڑی یعنی لمبی بحروں میں پیچیدگی اور دماغی ورزش کے در آنے کے امکانات کہیں زیادہ ہیں۔

(۶۳)

قلق میرٹھی۔ حیات اور کارنامے۔ جلال انجم، مطبوعہ ۱۹۸۷

(ص ۲۵۸): ـــ " بہارستانِ ناز جو خواتین کا پہلا تذکرہ ہے اس پر
تقریظ لکھنا ان (قلق) کے ادبی مرتبہ کا پتہ دیتا ہے
اسی طرح سب سے زیادہ غالب کے مکاتیب پر تقریظ لکھنا
وہ بھی غالب کی زندگی میں۔ یہ بات نہ صرف انھیں غالب کے
برابر لاتی ہے بلکہ بلند بھی کرتی ہے۔ غالب کے مزاج میں
چونکہ انانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لیے وہ اپنی کتاب پر
کسی کم مرتبہ شخص کی تقریظ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔
یہ اس کا کھلا ثبوت ہے کہ اس عہد میں ان (قلق) کا مرتبہ غالب کے

ہم پلّہ ضرور بن چکا تھا۔"

۱۔ اگر بہارستانِ ناز پر تقریظ لکھنے کے معنی قلق کے ادبی مرتبے کے بلند ہونے کے ہیں تو بہارستانِ ناز کے مؤلف رنج میرٹھی (شاگردِ غالب) کا مرتبہ تو قلق سے کہیں اونچا ہونا چاہیے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ (رنج شاگرد غالب مؤلف تذکرہ بہارستانِ ناز) قطعی اوسط درجے کے شاعر تھے اور شعرِ قلق سے ان کے شعر کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ رنج میرٹھ کے تھے، جیساکہ قلق تھے اور قلق سے تین سال چھوٹے تھے۔ قلق اور تقریظ لکھنے کی وجہ ظاہر ہے۔

۲:۔ عودِ ہندی کے ناشر بھی ممتاز علی خاں تھے اور ایک طرح سے جامعِ مکتوباتِ غالب بھی۔ وہ میرٹھ کے تھے۔ عودِ ہندی جس مطبع میں چھپی یعنی مطبع مجتبائی وہ بھی میرٹھ میں تھا اور قلق بھی میرٹھ کے تھے۔ ممتاز علی خاں رئیس بھی تھے۔ انھیں کے کہنے سے قلق نے تقریظ لکھی، اس میں غالب کی خواہش کو دخل نہ تھا۔ یوں بھی قلق، غالب سے ۳۶ سال چھوٹے تھے۔

اب تقریظ میں دیے ہوئے قلق کے چند شعر بھی دیکھیے، جو انھوں نے غالب کی مدح میں کہے ہیں ؎

لکھے کیا کوئی اوجِ فکرِ غالب — بیاں سے دور حرفِ ذکرِ غالب
سخن دانی اگر ہووے کوئی دین — تو ایماں سب کا ہو غالب کا آئین
نہیں اس کا سخن میں کوئی ہمدوش — کہ اک حرف اس کا اور معنی صد آغوش
کھلے جب مرتبہ رتبہ کا اس سے — فلک دے داد اور مجھ سے زباں لے

کیا اس کے بعد محض ان تقریظوں کی بنا پر قلق کو غالب کا ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

(۶۴)

مقالاتِ شبلی، جلد پنجم۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء ص ۱۲۸

----- خزانۂ عامرہ، بلکہ آزاد [مولوی غلام علی آزاد بلگرامی]

کے تینوں تذکرے گویا لغو اشعار کا مجموعہ ہیں ---- اس زمانے
میں تمام ہندوستان کا مذاقِ شاعری سخت خراب ہو چکا تھا ---
یہاں تک کہ حضرت مظہر جانِ جاناں نے ریزۂ جواہر (خریطۂ
جواہر) انتخاب کیا - میں نے ثقاتِ دہلی سے سنا ہے کہ
مرزا غالب وغیرہ کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی
شاعری کا مذاقِ صحیح جو دوبارہ قائم ہوا، وہ اس انتخاب نے
قائم کیا ———"

مولانا شبلی نے یہ مضمون ۱۹۰۵ء میں لکھا تھا آج (۱۹۹۸ء میں) ۹۳ سال بعد اس پر نظر ڈالیے - اس سے ہندوستان میں فارسی شاعری کی آخری صدی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے - مولانا شبلی فارسی زبان و ادب کا نہایت اعلیٰ و ارفع مذاق رکھتے تھے، اس لیے ان کی رائے بڑا وزن رکھتی ہے -

مرزا مظہر جانِ جاناں (ولادت تقریباً ۱۱۱۰ھ، وفات ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ)، تحریکِ ترکِ ایہام گوئی کے بانی سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ، جذبات نگاری، فطری اور حقیقی شاعری، پر زور دیا، اور اسے مروّج کیا - اردو شاعری میں بھی خریطۂ جواہر (ریزۂ جواہر۔ شبلی) کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں تقریباً پانچ سو معروف اور غیر معروف شاعروں کا کلام ہے اگرچہ یہ انتخاب میری نظر سے نہیں گذرا تاہم اس کے متعدد قلمی[1] اور مطبوعہ نسخوں کا سراغ ملتا ہے ———

یہ پہلی بار دیوانِ مرزا مظہر جانِ جاناں کے ساتھ ۱۲۷۱ھ میں مطبع مصطفائی کانپور سے چھپا تھا اس میں حضرت مظہر کے خود نوشت حالات بھی ہیں، پھر یہ دیوان کے ساتھ اور الگ بھی شائع ہوا -

---

[1] ان میں وہ قلمی نسخے بھی شامل ہونگے جو مظہر کی حیات میں لکھے گئے ہونگے

(۶۵)

اردوئے معلّٰی۔ شمارہ جنوری ۱۹۰۷ء۔ مولانا حسرت موہانی

"۔۔۔۔ منشی (نول کشور) صاحب نے ایک گلدستہ نکالنا شروع کیا تھا اس میں ماہوار مشاعرے کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔

کسی گلدستے میں نسیمؔ دہلوی کی ایک غزل دیکھ کر مرزا غالبؔ نے منشی نول کشور سے ان کا حال دریافت کیا اور ان کی چند دیگر غزلوں کا شوق ظاہر کیا، منشی صاحب نے بدقّت تمام سب حال پوچھ کر لکھا اور غزلیں بھی بھیجیں۔

غالبؔ نے اپنی کمال پسندیدگی کا اظہار کیا اور ان (نسیمؔ) کا دہلوی ہونا معلوم کر کے لکھا کہ، کہربا جستم و عقیق یافتم (کہربا = ایک قسم کا گوند جو گھاس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے[۱])۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میں نے خیال کیا تھا کہ یہ کہربا ہوگا مگر یہ "نسیمؔ، تو ہیرا نکلا(رضا)"۔"

یہ خط غالبؔ کے خطوط بنام منشی نول کشور میں نہیں۔ شاید گم ہو گیا ہو۔ حسرت موہانی ثقہ راوی ہیں انھوں نے اپنے استاد امیر اللہ تسلیم سے سُنا ہوگا۔ تسلیم

---

[۱] گر پڑے کاہ ضعف سے ہیں ہم ۔۔۔ کھینچ لانے کو کہربا ہیں ہم

کشش اس میں ہے کہربا کی سی ۔۔۔ کاہ کی قدر کب وہ جانے ہے

(یہ شعر غالبؔ کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کے ہیں)

کو خود نسیم نے یا منشی نول کشور نے بتایا ہو گا۔

اصغر علی خاں نسیم دہلوی ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے بقول مؤلف دیوانِ نسیم ـ ـ ـ ـ جس کا نام ہے دفترِ شگرف) ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) میں لکھنؤ میں آئے ۔ اور ۱۲۸۲ھ میں چہاردہم ماہ رمضان المبارک (یکم فروری ۱۸۶۶ء) کو انتقال کیا۔ یعنی، غالب کے سفر کلکتہ کے دوران میں جو تین چار سال پہلے شروع ہو کر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو ختم ہوا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ غالب کو نسیم کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں۔

نہیں معلوم کہ منشی نول کشور نے گلدستہ شائع کرنا کب شروع کیا۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہ واقعہ مومن کے انتقال (۱۴ مئی ۱۸۵۲ء) کے بعد اور یکم فروری ۱۸۶۶ء سے پہلے کا ہو گا۔

(۶۶)

تاریخِ جدولیہ از منشی خادم علی۔ طبع مدرسہ آگرہ۔ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء

(ص ۱۳۷) اسد اللہ خاں غالب (پسر) عبد اللہ بیگ خاں۔ اپنے وقت کے افضل، انوری، و خاقانی، سے ہیں اور معروف مرزا نوشہ، ابتدا میں رونق بخشِ سکونتِ اکبر آباد تھے۔ اب دہلی کو اپنے قیام سے منور کیا ہے ـــــ"

(ص ۱۴۲) ذوق دہلوی، سبحان اللہ اپنے وقت کے میر ہیں اور مخاطب بر خاقانیِ ہند اور نام شیخ محمد ابراہیم ـــ

(ص ایضاً) الٰہی بخش خاں معروف (پسر) قاسم جان دہلوی قطعِ نظر شاعری کے فقیر بھی تھے ۔ محاورہ بندی میں اچھے کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔

یہ دونوں سال (۱۲۷۰ھ اور ۱۸۵۴ء) اس ضخیم کتاب تاریخ جدولیہ کے سرورق

(حاشیہ صفحہ ۱۴۵ پر دیکھیے)

پر درج ہیں۔ جس کے معنی ہیں کہ کتاب کا مسودہ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء سے پہلے مطبع میں برائے طباعت دیا جا چکا تھا۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ کتاب ۱۲۶۹ھ مطابق (۱۴ اکتوبر ۱۸۵۳ء) تک مدوّن ہو چکی تھی۔ اس وقت غالب کی عمر ۵۶ سال اور ذوق کی (سالِ ولادت ۱۲۰۳ھ/ ۸۹-۱۷۸۸ء) ۶۵ سال تھی۔ اور غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کو انتقال کیے ۲۷ سال ہو چکے تھے۔

تاریخ جدولیہ میں غالب کو بجا طور پر "نقشۂ شعرائے فارسی نامی" میں جگہ دی گئی ہے کیونکہ ۲۸/۱۸۲۷ء سے غالب نے اُردو کی جگہ فارسی میں کہنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ جہاں اس بیس سال (۱۸۴۷ء تک) کے عرصہ میں انہوں نے تین سو سے بھی کم اردو اشعار کہے، وہاں فارسی میں ہزاروں شعر کہہ ڈالے حتیٰ کہ ان کے کلیاتِ فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں ۶۶۹۴ شعر ہیں جبکہ ۱۸۲۷ء سے پہلے صرف ۲۷ فارسی غزلوں اور ۱۳ رباعیوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے لہٰذا انہیں مؤلفِ تاریخ جدولیہ نے فارسی شاعر مانا ہے اور انوری اور خاقانی سے افضل تسلیم کیا ہے۔ ذوق بلاشبہ اس عہد کے اُردو کے مشہور ترین شاعر تھے۔

معروف کے بارے میں مؤلف تاریخ جدولیہ ایک اہم اطلاع دیتا ہے چونکہ یہ اِطلاع غالب اور ذوق دونوں کی زندگی میں طبع ہوئی ہے اس لیے خاص توجہ چاہتی ہے۔ وہ کہتا ہے "معروف کو کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی"۔

یعنی معروف کبھی کبھی ذوق سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے اس کی تائید تذکرۂ شمیم سخن (۱۸۷۲ء) اس طرح کرتا ہے۔

"آخر میں ..... ذوق دہلوی سے اصلاح لینا شروع کی"۔

اور یہ اضافہ کیا۔

"دیوانِ معروف جو رائج ہے ..... ذوق کا ہی اصلاحی ہے"۔

(حاشیہ صفحہ ۱۴۴ کا) ۱؎ حقیقت میں عارف جان چاہیے جو قاسم جان کے چھوٹے بھائی تھے۔ مؤلف سے سہو ہوا ہے۔

آزاد نے ۱۸۸۰ء میں آبِ حیات میں ذوق کے ترجمے میں اس بیان کی تائید مزید ہی نہیں کی بلکہ مبالغے سے کام لیا۔ تاہم حقیقت وہی ہے جو مؤلف تاریخ جدولیہ نے لکھی ہے، یعنی (دوسرے اساتذہ یا استاد کے علاوہ معروف کو) کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔ اس میں کبھی کبھار کی اصلاح اور کبھی کبھار اپنے اشعار کی عطا دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔

(۶۷)

حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی مطبوعہ مطبع شوکت المطابع میرٹھ ۱۳۱۷ھ

حل کردہ

حلال، غوامضِ سخن، شہنشاہِ اقلیمِ فن

مجدد السنۂ شرقیہ، ابوادریس مولانا حافظ احمد شوکت مالک و مدیر

اخبارِ شحنۂ ہند و طوطیِ ہند و پروانہ

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ روزن میں

حل۔ مرے تن میں زخموں کی اس قدر درازیں کھلی ہوئی ہیں کہ کوئی زخم بخیہ کے لائق نہیں۔ تارِ اشک خود چشمِ روزن کا رشتہ بن گیا ہے پھر بخیہ کا تار اس میں کب سما سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ خود سوزن میرے زخموں کی حالت دیکھ کر یاس سے روتی ہے کہ ان میں بخیہ نہیں ہو سکتا۔

ہوئی ہے مانعِ شوقِ تماشہ خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

---

[1] ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء - ۱۹۰۰) کی چھپی ہوئی یہ شرح اب بہت کم یاب ہے
ان اشعار کی شرح ۹۵/۹۶ پر درج ہے

حل:۔ سیلاب کا طوفان جو میرے گھر کو ڈھا چھوڑ کر چلا گیا ہے تو اس کے جھاگ روئی کے پھاہے کی طرح دیواروں کے روزنوں میں رہ گئے ہیں۔ میں کیسا بے کس بدقسمت ہوں کہ کوئی شخص میری خانہ ویرانی کا تماشا بھی نہیں دیکھ سکتا کیونکہ سوراخوں میں جو جھاگ ہیں وہ تماشا دیکھنے کے مانع ہیں۔

ودیعت خانۂ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں نگیں نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

حل:۔ میں معشوق کی کاوشوں کے ظلم کا ہمہ تن ودیعت خانہ بنا ہوا ہوں اور یہ قاعدہ ہے کہ ودیعت پر مہر لگا دیتے ہیں تو میرا ہر قطرۂ خوں اُس ودیعت خانہ کی مُہر ہے جس پر مژگانِ معشوق کا نام کندہ ہے یعنی میں کاوشوں کا ظلم ضبط کر رہا ہوں اور راز افشا نہیں کرتا کیونکہ امانت دار ہوں۔

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

حل:۔ منعِ بے ربطی عین ربط ہے جیسے عدم العدم وجود اور نفی النفی اثبات ہے۔

اب سنیے:۔ احباب جس قدر ملامت کرتے ہیں اُسی قدر جنون کو ربط ہوتا ہے۔ گویا ملامت کے وقت احباب کی خندہ زنی ہی جیب و دامن کا بخیہ بن گئی ہے۔ چونکہ ہنسنے میں انسان کے لب ازہم جُدا ہو جاتے ہیں پس اِدھر یاروں نے خندہ اُڑایا اُدھر جیب و دامن کا بخیہ کھُل گیا تو گویا خندہ ہی بخیۂ جیب و دامن ہوا۔ پس ربطِ جنون قائم رہا مثلاً عشق کی تعمیر میں ویرانی ہے ویرانی قایم رہے۔ بات بہت نازک ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

حل:۔ مہروش کی جو مثال (تصویر) آئینے (شیشے کے چوکھٹے) میں لگی ہوئی تھی تو اس کے جلوے سے آئینے کے جوہر یوں اڑنے لگے جیسے روزنوں میں ذرّے آفتاب کی شعاع سے اڑتے ہیں، جب تصویر کے جلوہ کی یہ حالت ہے تو صاحبِ تصویر (خود معشوق) کا جلوہ کیا ستم ڈھائے گا۔ ناصر علی بھی بعینہٖ یہی مضمون یوں باندھ گیا ہے

تو تا آئینہ دار وداری اے خورشید خاور ہا برنگِ ذرّۂ روزن بہ پرواز ند جوہر ہا

ناظرین اچھی طرح مطابقت کر لیں ۔۔۔۔۔۔“

شوکت میرٹھی! بیشتر مشاہیر شعراء کے مقابلے میں غالب کو بہتر شاعر مانتے تھے ۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مندرجۂ بالا اشعار کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے کہیں بھی غالب پر نکتہ چینی نہیں کی ۔ آخر میں اگرچہ غالب کے شعر کو ناصر علی کے فارسی شعر کا چربہ ثابت کیا ہے، مگر پورے ادب و احترام کے ساتھ کہیں استہزا کی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی ۔ تاہم جب جالب دہلوی سے (جو غالب پرست جانے جاتے تھے) ٹھن گئی تو انھوں نے غالب کو بھی معاف نہیں کیا اور اپنے اخبار شحنۂ ہند میں خوب خوب پرلچے اڑائے ۔ ۸ ۔ جون ۱۸۹۶ء کے شمارے میں اپنی عادت کے مطابق لکھتے ہیں ۔ ” ہم کو میاں جالب دہلوی سے تو کیا کسی سے بھی عناد نہیں ۔ کیونکہ شحنۂ ہند ایشیائی شعراء کا رفارمر اور مجدّد ہے اور دل میں عناد رکھنا رفارمروں کی شان نہیں ۔ البتّہ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ شحنۂ ہند کی تجدیدِ فن اور اس کے کمال و جوہر کو دل میں تو تسلیم ۔۔۔۔۔ کرتے ہیں مگر خواہ مخواہ کے حسد یا اپنی کسرِ شان کے باعث اقرار کرتے ہوئے ان کی زبان لکنت کھاتی ہے تو ہمارے عزیز میاں جالب ہی فرمائیں کہ یہ رنج اور صدمہ پہنچنے کی بات ہے یا نہیں ۔۔۔۔۔ اچھا صاحب خاقانی، انوری، متنبیؔ، حماسہ کو جلنے دو آج کل کے شعرا اپنے سلسلہ کا پیوند حضرت غالب کے رنگ پر لکھنا تو کجا کوئی صاحب غالب کا کلام سمجھ ہی لیں، کوئی صاحب غالب کے مندرجۂ ذیل اشعار کا مطلب تو بتائیں ؎

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں

ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

مصرعہ اولیٰ میں ترکیب بخیہ کے درخور دور اجنبی ہے اگر یوں کہتا ؎

نہیں ہے زخم کوئی درخورِ بخیہ مرے تن میں

یا یوں کہتا ؎

نہیں ہے زخم کوئی قابلِ بخیہ مرے تن میں

تو کیا حیرانی تھی۔ غالبؔ کے پوتے اور پر پوتے اور نام لیوا اس کا جواب دیں۔ مگر سمجھ کر۔ اور لیجیے۔ ؎

ہوئی ہے مانعِ شوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

اگر غالبؔ کے دونوں مصرعوں میں تھوڑا سا تصرف ہو کر یہ شعر یوں ہو جائے تو عمدہ ہے یا نہیں ؎

ہوئی ہے سدِّ رہ شوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

بھلا اسی غزل کے مندرجۂ ذیل شعر کو سمجھ کر اصلاح کی عمدگی یا سقم تو بتائیں ؎

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

مصرعۂ اولیٰ میں لفظ "کاوش" موزوں نہیں اور مصرعۂ دویم میں مضاف و مضاف الیہ کے مابین "مرے" کا تداخل کھٹکتا ہے۔ اصلاح ؎

ودیعت خانۂ دل بستۂ بیدادِ مژگاں ہوں
نگینِ نامِ خود شاہد ہے ہر یک قطرۂ خوں تن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

اگر دوسرا مصرعہ یوں ہو تو کیا ع

ہوا ہمدم کا خندہ بخیہ چاکِ جیب و دامن میں

ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

اگر دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو کیسا ع

پر افشاں جوہرِ آئینہ مثلِ ذرّہ روزن میں "

(۶۸)

عصرِ جدید سعید منزل میرٹھ

بقولِ صاحب تاریخ صحافت اُردو یہ ماہانہ رسالہ جنوری ۱۹۰۳ء کو جاری ہوا تھا۔ میرے کتب خانے میں اس کے کوئی ڈیڑھ درجن شمارے موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ رسالہ ہر پنجشنبہ کو شائع ہونے لگا تھا۔ سرورق پر درج ہے

" جامعہ اسلامیہ کی ہیئت فعال کا آرگن جو ہر پنجشنبہ کو شائع ہوتا ہے۔"

میرے کتب خانے میں دو شمارے بسلسلۂ غالبیات خاصے اہم ہیں پہلا یکم اکتوبر ۱۹۱۴ء کا اور دوسرا ۱۹ نومبر ۱۹۱۴ء کا، پہلے میں ایک مراسلہ "از جناب مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی،، شائع ہوا ہے اور دوسرے میں جوابًا ایک مراسلہ " از جناب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی" چھپا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

کلیّاتِ اُردو مرزا غالبؔ کا صحیح ایڈیشن

(از جناب مولانا سیّد احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی)

بعض اخباروں میں تحریک ہو رہی ہے اور انجمن ترقی اُردو کا بھی منشا ہے کہ کلیات مندرجہ عنوان کا صحیح ایڈیشن کسی طرح طبع ہو کیونکہ مخالف مطابع میں اس کی ہزاروں جلدیں چھپیں مگر کسی نے صحیح چھاپ کر حضرت غالبؔ مرحوم کی روح کو خوش نہ کیا۔ ان کے مزار نے تو بزبانِ حال یہی صدا دی کہ شعرم را بمطابع کہ بُرد۔

تقریبًا دو سال ہوئے کہ ادیب آنجہانی نے اس کلیّات

کے صحیح چھاپنے کا اعلان دیا اور اس کے واسطے کچھ چندہ بھی جمع ہوا مگر پھر کچھ حال معلوم نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر کانپور کے ایک مالک جنتری نے بھی یہ خواہش ظاہر کی۔ ہم نے سب کی ہوس خام پکانے پر اخبار مشرق میں ایک گرما گرم مضمون دیا کہ نہ یہ دیگ دم پخت ہو سکتی ہے نہ اس خیالی پلاؤ سے قلوب تازے ہو سکتے ہیں کیونکہ مادرِ اُردو کا وہ نرینہ فرزند اس میدان کا مرد بن سکتا ہے جو حضرت غالبؔ کا ادق اور نازک کلام سمجھ سکے۔

کمین گاہِ سخن عاجز کند معنی نگاراں را
خس ایں بیشہ پہلو میدرد آتش سواراں را

ہم نے ۶۰ برس کے عرصہ تک انتظار دیکھ کر صحیح چھاپا اور صحیح حل کیا اور سینکڑوں جلدیں مختلف مقامات خصوصاً سررشتہ تعلیم میں پہنچ گئیں اور پہنچ رہی ہیں اور اب گورنمنٹ گزٹ میں اعلان ہوا ہے کہ زنانہ مدارس میں اس کو رواج دیا جائے کچھ جلدیں باقی ہیں وہ نکل جائیں تو ہم خود مکرّر ایڈیشن چھپوائیں گے اور جو اشعار حل ہونے سے رہ گئے یعنی ہم نے ان کو آسان اور عام فہم سمجھا مگر پبلک کی فہم ان کے معانی و مطالب کے سمجھنے سے قاصر معلوم ہوگی وہ بھی حل کر دیے جائیں گے اور پہلے ایڈیشن کی نسبت لکھائی چھپائی کاغذ ترتیب وغیرہ بہتر ہوگی اور اور معانی و مطالب کا زیادہ انکشاف کیا جائے گا انشاءاللہ۔ اگر کوئی مطبع اس کی طبع کا ارادہ کرے اور ہمارا پورا حق ہم کو دے تو ہم اجازت بھی دے سکتے ہیں اور صحیح چھاپنے میں مدد بھی۔ مگر ایسی امید کم ہے کیونکہ جوہر شناسی اور قدر دانی

معدوم ہے، کوڑیاں خرچ کرکے لوگ اشرفیاں بٹورنا چاہتے ہیں۔

بعض ادق اشعار کا حل ہم نے عمداً چھوڑ دیا کیونکہ ہم کو معلوم تھا کہ بڑے مال پر دادا جان کی فاتحہ پڑھنے والے ضرور پیدا ہونگے۔ چنانچہ پیدا ہوئے اور بے ہنگم بے تصرف اور غلط ملط کرکے ہمارا حل اُچک لیا اور ایک کمپاونڈ تیار کیا۔ مگر کالائے بد بریش خاوند ——

اب ہم ذیل میں چند اشعار پیش کرتے ہیں جو حضرات صحیح ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ کریں اگر یہ اشعار ان کے نزدیک صحیح ہیں تو اُن کے معانی و مطالب بتائیں اور غلط ہیں تو صحیح کرکے دکھائیں ورنہ پبلک میں ناکامی اور بدنامی ہوگی۔ کیونکہ کلیاتِ مذکور ہرگز چھپ نہ سکے گا۔ اور حل تو کیا کرے گا۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

موجودہ حالت میں دونوں مصرعوں کا ایک ہی مطلب ہے،
غور سے سمجھیں ؎

ہے دل میں کاوشِ صفِ مژگاں کو ردکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

سراغِ تفِ نالۂ داغِ دل ہے
کہ شبرو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اور جو صاحب حل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ مندرجہ ذیل اشعار

کے معنے بتائیں

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

واضح ہو کہ اس شعر کے جو معنی مشہور ہیں ان سے عاشق کے لیے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور یہ غیر ممکن ہے کہ غالبؔ کے شعر میں نتیجہ نہ ہو ؎

سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوٰے پارسائی کا

تمنائی زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدستِ پائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بمہرِ صد نظر ثابت ہے دعوٰی پارسائی کا

ہجومِ نالہ حسرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

بہت شگفتہ اور صاف حل ہو اور نتیجہ بھی ضرور ہو۔ اور مطلب اشعار کے الفاظ سے نکلے نہ کہ اِدھر اُدھر سے یعنی اَلَّم غَلَّم اڑان گھاٹی نہ بنائی جائے۔ ہم نے بعض اشعار حل کر کے چھاپے ہیں اور بعض حل نہیں کیے۔ تاہم سب کو حل کریں تین ہفتہ کے بعد ہم خود مندرجہ بالا اشعار کو صحیح کر کے اور لاینحل اشعار کو حل کر کے ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

یہ سوال فضول ہے کہ دیسی کتابیں وغیرہ کیوں غلط چھپتی ہیں، تمام مطابع کو دیکھ جائیے ایک کتاب بھی ایسی نظر سے نہ گزرے گی جس میں بیسیوں اور بعض میں سینکڑوں غلطیاں نہ ہوں۔ جتنی بڑی ضخیم و جسیم، لحیم و شحیم کتاب ہوگی اس قدر کثرت سے اس میں غلطیاں ہوں گی۔ جو کتابیں خاص اہتمام سے چھاپی جاتی ہیں اور جن کے صحیح چھپنے کے لیے سعیِ بلیغ کی جاتی ہے۔ غیر ممکن ہے کہ اخیر میں غلطنامہ ہم نے لگا دیکھا ہے لوگ اہلِ مطابع کو معقول چھپائیاں دیتے ہیں مگر غلط پنو اڑے ان کے ماتھے مارے جاتے ہیں اور سفید کاغذ اپنے نامۂ اعمال کی طرح کالے کیے جاتے ہیں۔ جب اُردو کتابیں صحیح نہیں چھپ سکتیں تو فارسی اور عربی کتابوں کا خدا ہی حافظ ہے جن کے غلط چھاپنے کا ایک گرانڈیل عریض و طویل مطبع نے ٹھیکہ لے رکھا ہے دیسی مدارس عربیّہ کی درسی کتابوں -

- - - - - - - - اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے کورسوں کا غلط چھپنا قیامت ہے۔ یونیورسٹی الٰہ آباد کا ایم-اے اور بی۔ اے کورس اس قدر غلط چھپا ہے کہ شاید ہی کوئی سطر غلطی سے خالی ہو۔ اوّل تو کتابیں ادق جن کو نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ پڑھا سکتا ہے۔ پھر ان کا غلط چھپنا کرڑوا کریلا اور پھر نیم چڑھا والی کہاوت ہے۔ ماسٹر اور اسکالر، پروفیسر اور کالیجٹ سب سٹپٹاتے پھرتے ہیں۔ عالیشان ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ کی جانب پبلک نہایت حیرت سے دیکھ رہی ہے کہ لاکھوں روپیہ برباد جا رہا ہے۔ بظاہر طلباء تعلیم پا رہے ہیں مگر حاصل وصول کچھ نہیں۔

ہم صداقت کے بڑے دعوے سے کہتے ہیں اور ہر وقت ثبوت دینے کو تیار ہیں کہ صوبۂ متحدہ آگرہ اودھ میں بی۔ اے اور ایم۔ اے پرشین کورسوں کے قصائد خاقانی وغیرہ کا سمجھنے اور سمجھانے اور پڑھانے والا کوئی نہیں۔ اگر کسی نے حل کیا ہے تو وہ غلط در غلط ہے۔ کورس کی مطبوعہ غلطیاں بھی صحیح نہیں کر سکا اور مشکل و ادق اشعار جو بالکل سمجھ میں نہیں آئے چھوڑ گیا ہے۔ البتہ خاقانی کے جو قصائد مرحلہ پنجاب یونیورسٹی ہم نے حل کیے ہیں اور اب الٰہ آباد یونیورسٹی نے بھی اپنے کورس میں لے لیے ہیں، ان کا حل جو چھپا یا گیا ہے وہ صحیح ہے کیونکہ نقل را چہ عقل۔ یہ مصیبت صرف فارسی کورس میں ہے انگریزی میں نہیں۔ عربی کی جو کتابیں قسطنطنیہ، بیروت، مصر وغیرہ میں چھپتی ہیں۔ نیز یورپ کی زبانوں کی جو کتابیں لندن، پیرس، برلن وغیرہ میں طبع ہوتی ہیں کیا ان کے چھاپنے والے فرشتے ہیں جو غلطی نہیں کرتے۔ مذکورہ بالا زبانوں کی کسی کتاب کے ساتھ غلط نامے کی دُم نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ تصحیح کے لیے قابلیت درکار ہے اور جو لوگ شاذ و نادر قابلیت رکھتے ہیں دیسی پریس ان کی قدر نہیں کرتا۔ بیسیوں پریسوں میں مصحح ہوتا ہی نہیں ہے کاپی نویس نے مکھی پر مکھی مار دی۔ پریس مین نے کاغذ کالے کر دیئے۔ چلیے ٹکے سیدھے ہو گئے، ہم چاہتے ہیں کہ دیسی پریس بدنامی کی یہ کالی کملی سر سے اُتار پھینک دے۔

اُردو کلّیات غالبؔ کا صحیح ایڈیشن

(از جناب سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی)

عنوانِ بالا سے یکم اکتوبر کے عصرِ جدید میں مولانا احمد حسن شوکتؔ میرٹھی نے جن کی حداثتِ طبع اور نئی نئی باتوں پر اکثر لوگ مسکرادیا کرتے ہیں، ایک مضمون رقم فرما کر چھپوایا ہے اور میرے بعض عنایت فرما مُصِر ہیں کہ انجمنِ اُردو کی طرف سے اس کا ایک رسمی اور مختصر جواب انھیں کالموں میں دے دیا جائے۔ امّید ہے کہ ایڈیٹر صاحب عصرِ جدید بھی اس کی اشاعت میں دریغ نہ فرمائیں گے۔

(۱) تصحیح کتابت اس معاملہ میں شوکتؔ صاحب کو اتنا وہم ناحق ہے۔ کیونکہ مرزا صاحب مرحوم نے اپنے سامنے اپنا کلام چھپوایا تھا اور خود تصحیح کی تھی۔ چنانچہ خاص مرزا صاحب کے صحیح کیے ہوئے نسخے ابھی تک موجود ہیں اور مولانا حسرتؔ موہانی نے جو کلیات وشرح چھپوائی ہے وہ بھی انھیں نسخوں کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ نواب احمد سعید خان صاحب طالب دہلوی کے پاس ایک قلمی نسخہ کلّیات کا موجود ہے جن میں بعض غیر مطبوعہ اشعار ہیں۔ اور لکھّا ہوا بھی بہت احتیاط سے ہے۔ نواب صاحب موصوف نے ازراہِ عنایت اس نسخے کو مستعار دے دیا تھا اور انجمن نے اس سے بھی مطابقت کرلی ہے جس کے بعد تصحیح کتابت

کی طرف سے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔
شوکت صاحب نے جن چار شعروں کی صحیح کتابت کی دریافت کی ہے اُن میں دوسرا اور چوتھا شعر یوں ہے۔

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

سراغِ تفِ نالہ ہے داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

پہلے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل کو یار کی پوری صفِ مژگان سے مقابلہ درپیش ہے۔ حالانکہ طاقت اتنی بھی نہیں کہ ایک کانٹے کی خلش برداشت کر سکیں (وہاں تو سیکڑوں کانٹے ایک ہی پلک میں ہیں۔)
دوسرا اور بھی صاف ہے کہ اگر ہماری آہ و زاری کا سراغ لگانا منظور ہو تو دل میں جو داغ پڑ گئے ہیں ان سے لگالو۔ کیونکہ جو رہ گیر رات کو گذر گیا اس کا کھوج نقشِ قدم سے ہی چلایا کرتے ہیں۔ گویا ہمارے پُرسوز نالوں کی یادگار داغِ دل رہ گئے ہیں اسی طرح جس طرح شبرو کی یادگار اس کے نقشِ قدم رہ جاتے ہیں۔
شوکت صاحب کے باقی دونوں شعروں کی کتابت بالکل درست ہے۔

(۱) یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ!
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

(۲) قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

پہلے کی نسبت میں مطلق نہیں سمجھا کہ شوکت صاحب کو کیا تردد لاحق ہے، مصرعۂ اولیٰ میں استفہام انکاری ہے اور شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ تم ہمارے دل میں نہیں ہو۔ ہاں دریافت طلب بات یہ ہے کہ جب ہر وقت دل میں رہتے ہو تو ملتے کیوں نہیں۔ نظر کیوں نہیں آتے۔

مولانا حسرت نے اس شعر کا مفہوم دوسرے پہلو سے لیا ہے مگر مولانا طباطبائی یہی کہتے ہیں جو میں نے اوپر لکھا۔ بہرحال دو پہلو رکھنے کے باوجود اس شعر میں کوئی دقّتِ معنوی یا لغوی نہیں ہے کہ جس شخص نے مرزا کا کلام پڑھا ہو وہ اس میں الجھ کر رہ جائے۔ دوسرا شعر البتہ کسی قدر پیچیدہ ہے، سو اس کے متعلق مولانا حالی نے خود مرزا غالب مرحوم سے استفسار کیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ "اے" کے بجائے "بجز" پڑھو مطلب صاف ہو جائے گا۔ (دیکھو یادگارِ غالب صفحہ ۱۱۴)

اب اس سے زیادہ تصحیحِ کتابت کی دلیل کیا ہوگی؟

(۲) حل اشعار۔ انجمن اردو مرزا صاحب کے تمام اشعار کا حل چھپوانا نہیں چاہتی۔ مولانا حسرت اور طباطبائی صاحب اس کام کو بوجہ احسن کر چکے ہیں۔ خال خال مقامات پر البتہ انجمن نوٹ لکھوائے گی تاکہ مرزا کے بعض مخصوص کمالاتِ شاعری زیادہ اجل جائیں اور

معنی بھی صاف ہو جائیں ۔ سو اس کام میں حتی المقدور نہایت محنت اور احتیاط کی جائے گی کہ مفہوم سمجھنے میں بھی غلطی نہ ہو اور سمجھایا بھی جائے اُسے نہایت آسان اور سلیس عبارت میں ۔ باقی رہے وہ شعر جن کے شوکتؔ صاحب نے اس زور و شور سے حل دریافت کیے ہیں تو ان کی نسبت عرض ہے کہ وہ کافی و شافی طور پر حسرتؔ و طباطبائی دونوں کی شرحوں میں موجود ہیں ان کی نقل یہاں لکھنا بیکار طوالت ہے ۔ ہاں اگر شوکتؔ صاحب کو ان شرحوں کے معانی پر کوئی اعتراض ہو تو وہ پیش کریں اگر ان کی نظر سے یہ دونوں کتابیں نہ گذری ہوں تو ایک پیسہ کا کارڈ راقم کے نام لکھ کر ڈال دیں کہ ان دونوں شرحوں میں جو حل درج ہیں ان کی نقل کرا کے حاضر خدمت کر دی جائیں ۔ اس وقت اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ مرزا صاحب کے یہ اشعار ان میں نہیں جن کے مطالب میں کسی کو کچھ تامل ہو ۔ ان میں اغلاق لفظی کے سوا کوئی معنوی پیچیدگی نہیں ہے البتہ شوکتؔ صاحب اجازت دیں تو میں بعض وہ شعر ان کی خدمت میں بھیجوں اور افادۃً ان کے معنی دریافت کروں کہ جن کا مفہوم شرحوں سے صاف نہیں ہوتا ۔۔۔۔

آخر میں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ انجمن اُردو کسی تجارتی غرض سے دیوانِ غالبؔ نہیں چھپوا رہی اور نہ اس کے لیے عام چندہ کیا گیا ہے، وہ صرف ایک عمدہ ایڈیشن اس کا تیار کرنا چاہتی ہے جو اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کی تمنا کے عین مطابق ہے ۔ خود مولانا شوکتؔ نے جو کلیاتِ اردو مع شرح کے چھپوایا ہے وہ نہایت گھٹیا اور

کثیف کاغذ پر ہے اور ان کی متصوفانہ و ملّایانہ شرح
بھی اسقام اور لایعنی عبارتوں سے مملو ہے۔ اس
حال میں ان کی یہ زبردستی کہ کوئی دوسرا بھی اچھا ایڈیشن
چھپوانے کا ارادہ نہ کرے نہایت ناروا شکک پر مبنی ہے
اور خصوصاً اس مضمون کے بعض حصوں میں تو اس درجہ
عامیانہ پن آگیا ہے کہ "عصرِ جدید" جیسے متین پرچے میں
اس کا شائع ہونا بھی میرے نزدیک امر غیر متوقع تھا۔

(۶۹)

صدر یار جنگ از مولوی شمس تبریز خاں۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۲ء

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی (ولادت ۵ جنوری ۱۸۶۷ء۔ وفات ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء) رئیس ہونے کے ساتھ علماء میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک تھے، ان کا کتب خانہ، جو اب علی گڑھ یونیورسٹی میں منتقل ہو چکا ہے، اپنے عہد کے ذاتی کتب خانوں میں اہم ترین مانا جاتا تھا۔ جناب مالک رام کی ایک تصنیف "وہ صورتیں الٰہی" میں ایک مبسوط مضمون ان کی شخصیت پر شامل ہے۔ غالب کی آخری عمر کی تصنیف "سبدِ چین" کا تقریباً ناپید مطبوعہ نسخہ مالک رام صاحب کو انھیں کے کتب خانے سے حاصل ہوا تھا۔ (سبدِ چین" کی جو نقل نواب صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ مالک رام صاحب کو بھجوائی تھی وہ نقل، پورا نسخہ، اب میرے کتب خانے میں ہے) غالب نے اپنی والدہ کا نام ---- (عزت النساء بیگم) صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے وہ بھی انھیں کے کتب خانے میں تھا۔ (اب علی گڑھ منتقل ہو گیا ہے) اور غالب کی وہ تصویر جو مالک رام صاحب کی کتاب "ذکرِ غالب" میں شامل ہے، اسی کتب خانے سے حاصل کی گئی تھی، غالب سے اس وابستگی کی وجہ سے اور نواب صاحب کی شیفتگیِ علم و ادب کے سبب مندرجۂ بالا کتاب

سے چند اقتباسات جو غالب سے متعلق ہیں یہاں جمع کیے جاتے ہیں (ص ۳۴)
" (بزبانی نواب صاحب) ۔۔۔۔۔ جب میں اُردو پڑھنے لگا تو مرزا غالب کی اردوے معلّٰے کا نسخہ مجھ کو عنایت ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا، کچھ سمجھتا بہت کچھ نہ سمجھتا تاہم دیکھے جاتا اور اتنا دیکھتا کہ والد مرحوم[1] (محمد تقی خاں۔ متوفی ۲۸ جون ۱۹۰۵ء) تنگ آجاتے۔ منع فرماتے ذوقِ ادب کی یہ بنیاد تھی ــــــــــــــ"

(ص ۳۹) غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر دادا صاحب[2] معالجے کے واسطے دلّی تشریف لے گئے تھے ۔۔۔۔ اس وقت کے ذکر میں مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ کا ذکر خصوصیت سے فرمایا کرتے تھے۔ دادا صاحب سے مفتی صاحب کے مراسم تھے اسی لیے ان کی اولاد کے حال پر شفقتِ بزرگانہ فرماتے تھے۔ مفتی صاحب کا مرض الموت فالج ہوا۔ یہ عیادت کو گئے تو ہاتھ پھیلا دیے۔ یہ قریب گئے تو سینے سے لگالیا، منھ چوما اور زار زار رونے لگے، کچھ فرمایا بھی مگر سمجھ میں نہ آیا ــــــــــــــ"

نواب صاحب کے دادا خان زماں خاں صاحب کا دلّی علاج کے لیے جانا یقیناً ۱۸۵۵ء (سالِ وفات سے پہلے ہوا ہوگا۔ یہاں عبارت گنجلک ہے۔ غالباً اس سے یہ مراد ہے کہ مفتی صاحب (آزردہ) بعدِ وفاتِ خان زماں خاں صاحب ان کی اولاد پر شفقتِ بزرگانہ فرماتے تھے۔ اور کہ مفتی آزردہ کے مرض الموت میں عیادت کو نواب شروانی صاحب کے دادا نہیں بلکہ والد محمد تقی خاں گئے تھے، جن کی عمر آزردہ کے انتقال کے وقت ۳۰ سال سے متجاوز تھی۔

(ص ۴۶) میں نے اُردوے معلّٰے کے ذوق کے سلسلے میں

---

[1] محمد تقی خاں۔ ولادت ۲۸/ ۱۸۳۷ء وفات ۲۸ جون ۱۹۰۵ء

[2] خان زماں خاں۔ ولادت ۱۷۹۲ء وفات ۱۸۵۵ء (لکھا ہے کہ ۵۶ برس کی عمر میں انتقال ہوا جو غلط ہے) عمر ۶۳ برس ہونی چاہیے۔

ہوشیار ہونے کے بعد مرزا غالب کی عودِ ہندی پڑھی اور
بہت پڑھی ۔"

(ص ۵۰) مولانا لطف اللہ صاحب (نواب صاحب کے استادِ محترم) کے والد
مولوی اسد اللہ مضطر کی غزل ؎

لے اڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے ۔۔۔ گل نے سیکھی روشِ چاک گریباں ہم سے
لاکھ روکا نہ رُکا دیدۂ گریاں ہم سے ۔۔۔ لو ہوا چاہتا ہے نوحؑ کا طوفاں ہم سے
پاؤں پھیلائے تو ہی رہنا یہاں اے بلبل ۔۔۔ چھوٹتا ہے کوئی دم میں یہ گلستاں ہم سے

کو مرزا غالب نے بہت پسند کیا اور نام معلوم ہونے پر کہا۔
"کیوں نہ ہو یہ نام کا کمال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

غالب کا یہ کہنا کہ یہ نام کا کمال ہے بہت بلیغ ہے ایک تو خود غالب کا نام اسد اللہ تھا دوسرے اسد اللہ حضرت علی مرتضیٰ کو کہتے ہیں ۔ جن سے غالب کو والہانہ عشق تھا ۔

(ص ۳۰۰) " دورِ اوّل کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اساتذہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سومنات کو
دار الشرک ہونے کے لحاظ سے قابلِ فتح جانتے تھے ،
رہا اس میں سوز و گداز یا حُسن کا جلوہ دیکھنا یہ نازک خیالی ہے
استادِ حزیں کے حصّہ میں آئی ۔ غالب کہتے ہیں ؎

یہ سومناتِ خیالم در آے تا بینم
رواں فروز برہ دوشہائے زنّاری

مقامِ حیرت ہے کہ اردو فارسی نظم و نثر میں "سومناتھ" کی تقدیس کی کبھی ترجمانی نہیں کی گئی ۔ سومناتھ ہندوؤں کے متبرک ترین ۱۲ جیوتی لنگوں میں پہلا جیوتی لنگ ہے ۔

(ص ۳۲۴) " نواب صاحب کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شروع سے اقبال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور غالب کے شاگرد منشی غلام غوث بے خبر الٰہ آبادی کی
صحبتیں میسر ہوئی تھیں ۔"
منشی غلام غوث بے خبر (۱۸۲۵ء تا ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء)

غالب کے شاگرد نہ تھے۔ بلکہ دوست اور مہربان تھے۔
(ص ۳۲۵) "نواب صدر یار جنگ تغزّل میں حافظ کے زیادہ قائل تھے
اور اس کے ساتھ ہی اساتذہ غزل میں امیر خسرو ......
شیخ علی حزیں اور غالب کے بڑے قدرداں تھے ....."
"...... حزیں کو خاتمۃ الشعراء کہا ہے ......"

(۷۰)

اُردوئے معلّٰے۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء ص ۳ ۴ ۴

غالب نے نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کو اپنے ایک خط مورخہ یک شنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۴ء[1] میں لکھتے ہیں۔

"صاحب وہ زمانہ نہیں، اِدھر متھرا داس[1] سے قرض لیا اُدھر دربای[2] مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی - ہر ایک پاس تمسک مہری موجود - شہد لگاؤ - چاٹو، نہ مول نہ سود اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر - یا ایں ہمہ کبھی خان[3] نے کچھ دے دیا - کبھی الور[4] سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں[5] نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رام پور کے قرض دینے والا ایک میر اختیار کار - وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے ...."

---

[1] یہ کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے، ۱۸۶۲ء چاہیے کیونکہ یک شنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء کو پڑتا ہے۔ نہ کہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۴ء کو ــــــ دوسرے اندرونی شواہد بھی ۱۸۶۲ء ہی کے حق میں ہیں۔

خط کا یہ اقتباس اہم ہے کیونکہ اس کے ذریعے روارَوی میں غالب کچھ ایسے انکشاف بھی کر گئے ہیں جو وہ عام حالات میں ظاہر کرنا پسند نہ کرتے۔ یہ بھی ہے کہ یہ خط جس کو لکھا گیا ہے وہ پہلے ہی ان کوائف سے واقف ہے اور غالب نے محض انھیں دہرا دیا ہے اب ذرا تفصیل سے نظر ڈالی جائے۔

۱ے متھراداس دہلی کے مشہور ساہوکار تھے مگر ہمیں اس درباری مل کے متعلق کوئی علم نہیں شاید یہ بھی ان ساہوکاروں میں سے ہوگا جن سے غالب کبھی اُدھار لیا کرتے تھے۔ خوب چند چین سُکھ کسی فرم کا نام معلوم ہوتا ہے اور کوٹھی سے مراد بھی ساہوکارے کی دکان ہی سے ہے جس سے غالب قرضہ اٹھاتے تھے، اگر ان کا تعلق آگرے سے ہے تو گویا غالب کی عمر کے ابتدائی حصّے کی بات ہے اور اگر دہلی سے ہے تو گویا غالب بیس پچیس سال کی عمر تک ان سے وقت بے وقت قرضہ لیتے رہتے تھے اور مہری تمسّک لکھ دیا کرتے تھے مگر نہ ہی کبھی مول چکانے کی فکر کیا کرتے تھے نہ سُود ادا کرنے کی۔ یہ تاوان ان کے بزرگ بھرتے تھے۔ وہ والدہ، پھوپھی، نانا، خسر، خسر کے بڑے بھائی کوئی بھی ہو سکتے تھے۔

یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا ملاحظہ کیجیے۔

۲ے (پھوپھی) اگر روٹی کی فکر یہ کرتی تھیں تو وہ آگرے ہی کی حد تک ممکن ہے کیونکہ غالب کی کسی ایسی پھوپھی کا ذکر نہیں ملتا جو ایسی خوشحال ہو کہ شادی کے بعد بھی غالب کے گھر گرہستی کو چلا سکتیں (ویسے غالب کی آخری پھوپھی کا انتقال ۲۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کو ہوا)

۳ے (خان) ۴ے (الور) سے مراد نواب احمد بخش خاں ہے کیونکہ الور سے غالب کو وہی کچھ دلا سکتے تھے۔ نواب احمد بخش خاں اکتوبر ۱۸۲۷ء میں مرے۔

۵ے ایک تحریر کی بنا پر قیاس ہے کہ غالب کی والدہ کا انتقال لگ بھگ ۱۸۴۰ء میں ہوا لیکن مرنے سے قبل وہ اس قابل نہ رہ گئی تھیں کہ غالب کی دامے درمے مدد کر سکتیں۔ غالباً والدہ کی طرف سے فتوحات کا سلسلہ بھی ۱۸۳۰ء تک ختم ہو چکا ہوگا۔

(۷۱)

تذکرۂ سائلؔ از حفیظ الرحمان واصفؔ۔ ۱۹۷۵ء

(ص ۵۷) "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دس سال[2] کے بعد مورخہ ۲۰ شوال ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۷ء[1] کو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے گھر پوتا ہوا۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سراج الدین احمد خاں (سائل) نام پایا ۔۔۔۔۔۔
بقول حضرت سائل صاحب ان کا مادۂ تاریخِ ولادت مرزا سراج دین احمد[3] خاں ہے۔

(ص ۵۸) ابھی پانچ سال کی عمر تھی کہ والدِ محترم نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کا ۱۲۸۶ھ میں انتقال ہوگیا[4] اور جب ۲۲[5] سال کی عمر ہوئی تو شفیق دادا (ضیاء الدین احمد خاں) نے بھی منہ موڑا[1]۔

اب نمبروار تشریح ملاحظہ فرمائیے۔

① ۲۰ شوال ۱۲۸۰ھ مطابق (۲۹ مارچ) ۱۸۶۴ء ہونا چاہیے ۱۸۶۷ء نہیں۔

② دس سال کی جگہ سات سال کہنا چاہیے۔

③ "مرزا سراج دین احمد خاں" سے صحیح سالِ ولادت (۱۲۸۰ھ) کی تصدیق ہوتی ہے۔

④ ثاقب کا انتقال ۶ محرم ۱۲۸۶ھ (۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء) کو ہوا تھا اس طرح ان کے بیٹے سائل کی عمر اس وقت پانچ سال سے کچھ اوپر تھی۔

---

[1] جناب مالک رام لکھتے ہیں: سالِ ولادت ۱۸۶۵ء تھا۔ اس طرح عمرِ عزیز (۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء) ۸۰ برس کی ہوئی" (وہ صورتیں الٰہی مقالہ سائل دہلوی ص ۴۹) مگر یہ غلط ہے سائل ۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے عیسوی حساب سے ۸۱ سال کی عمر پائی۔

⑤ سائل ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کے دادا نواب ضیاء الدین احمد خاں ۲۲ سال بعد ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ (۲۷ جون ۱۸۸۵ء) کو فوت ہوئے۔

مندرجہ بالا سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ غالبؔ کے انتقال کے وقت سائلؔ پانچ سال کے تھے۔ اب مندرجۂ ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

"مرزا غالبؔ سائل صاحب کے (دور کی دہری رشتہ داری کی وجہ سے) دادا ہوئے۔ ع "غالبؔ میرے دادا تھے غالبؔ کا میں پوتا ہوں۔" فرماتے تھے کہ جب میری [سائل کی] عمر پانچ سال کی تھی، اپنے دادا کے ساتھ مرزا غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا ایک مرتبہ مرزا صاحب نے مجھے کھانے کی کوئی چیز دی اور خود کسی کام سے اٹھ گئے اس وقت مرزا صاحب کے سامنے کوئی قلمی کتاب تھی۔ اُٹھتے وقت کتاب کھلی چھوڑ دی۔ میں نے کھانے کی چیز کو اس کتاب پر رکھ کر شوق کیا ...... دادا ناراض ہونے لگے۔ مرزا غالبؔ نے ...... کہا میرا بچّہ تو امتحان کی تیّاری کر رہا ہے ...... ورق خراب ہو چکا تھا، کچھ جھاڑ پونچھ کر کتاب کو رکھ دیا ..... مجھ سے کہا تم اپنے دادا سے فارسی پڑھتے ہو؟ لو ایک شعر کا مطلب تو بتاؤ۔ کوئی آسان اور سہل سا شعر تھا .... پھر خود مجھے سمجھانے کی کوشش فرمائی۔"

(۴۷)

حیات النذیر از افتخار عالم بلگرامی ثم المارہروی۔ ۱۹۱۲ء

ڈپٹی نذیر احمد (ولادت ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء وفات ۳ مئی ۱۹۱۲ء) معترضین کا جواب

دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

(ص ۲۶) "اس پر مجھ کو اسد اللہ خاں غالب یاد آئے کہ وہ بڑے مشکل گو شاعر تھے، وہ ابتدا میں فارسی[1] کہا کرتے تھے بلکہ فارسی بھی نہیں پارسی اور پارسی بھی ناآمیختہ بتازی[2]، اس پر انوکھے استعارات اچھوتی تشبیہات، لفظی تعقیدات۔ تو ان کا کلام مشکل ہوا ہی چاہیے۔ کوئی شخص کہتا تھا کہ ان ہی کے شعر کے ان سے معنے پوچھے تو کچھ دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا۔ بھئی اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا[3] تھا۔ ان کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا اور ریختہ گوئی کو متبذل اور دون مرتبہ سمجھتے تھے چنانچہ ایک ریختہ گو معاصر[4] کی طرف اشارہ کر کے ایک قصیدے میں تعریضاً فرماتے ہیں

ع آنچہ فخر تست در گفتار آں ننگ من است[5]

لیکن انگریزی عملداری کی وجہ سے جو انقلاب عظیم ہونے والا تھا اس کی صبح نمودار ہو چکی تھی اور زمانہ کہہ رہا تھا کہ مرزا صاحب اس بساط کو تہہ کیجیے کہ زبان فارسی نہ تو ہندوستان کی ملکی زبان ہے نہ اس میں علوم، کیوں آپ اس کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگلے لوگ کچھ مستقل مزاج بھی زیادہ ہوتے تھے۔ مرزا صاحب زیادہ مدتوں تک اسی فارسی کو پکڑے رہے مگر زمانے کے ساتھ کسی کی ضد کیا چلے۔ خاص کر شاعری تو پیٹ بھرے مشغلے ہیں اس وقت جیسا کچھ شاہی دربار تھا وہاں ریختہ ہی کی قدر تھی ناچار مرزا صاحب نے بھی بادل ناخواستہ ریختہ کا منہ چڑانا شروع کیا[6]۔ میں صرف نمونے کے طور پر ان کے اس وقت کے چند شعر پڑھتا ہوں

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے	دعوئ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل	یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

ایک اور تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ میں قصداً اتفاقی بندشوں کو چھانٹ کر لایا ہوں۔

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا	زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی ہمہ بد گمانی	میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

مرزا صاحب کی شاعری اس بات کا نمونہ ہے کہ زمانہ کیونکر اپنی جنتری میں سے لوگوں کو نکالتا ہے، وہ مرزا ریختہ گوئی کو ننگ سمجھتے تھے آخر آخر اپنی اردوے معلّٰی پر فخر کیا کرتے تھے، مرزا کے منہ سے اردو کے ساتھ معلّٰی کا لفظ' فاعتبروا یا اولی الابصار' - خیر تو ان دنوں کی مشق زوروں پر تھی اس کے بارے میں فرماتے ہیں سہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل	سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش	گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل (۷) "

اب تمام عبارت کا نمبر وار جائزہ لیا جاتا ہے ــــــ

(۱) غالب نے شاعری کی ابتدا فارسی سے نہیں بلکہ اردو سے کی، فارسی میں باقاعدہ ۲۸/۱۸۲۷ء سے شعر کہنے لگے۔ اس سے پہلے کا دریافت شدہ کلام صرف ۲۷ فارسی غزلیں اور ۱۳ رباعیاں ہیں۔

(۲) پنج آہنگ میں ایک خط شیفتہ کے نام ہے ـ لکھتے ہیں " امروز کہ ۔۔۔۔۔ اندوہِ درونی، بہ پارسی، نا آمیختہ بہ تازی نگاشتہ آمد ۔۔۔۔۔ " لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔

(۳) خود اپنا کہا غالب کی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ محض اختراع ہے، صداقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۴) معاصر ریختہ گو سے ذوق مراد لیے جاتے ہیں۔

(۵) غالب کا یہ مصرعہ ڈپٹی صاحب نے غلط لکھا ہے۔ یہ قطعہ غالب کے فارسی دیوان (پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء مطبوعہ) میں شامل ہے۔ مصرع یوں ہے ع

ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

(۶) یہ غلط محض ہے۔ غالبؔ کے بیشتر اشعار ریختہ جو زبان زدِ عام ہیں، فارسی گوئی کے آغاز ۲۸/۱۸۲۷ء سے پہلے کہے جا چکے تھے۔

(۷) ڈپٹی صاحب نے یہاں جتنے اشعار دیے ہیں، سب غالبؔ کے دیوان (پہلا ایڈیشن، مطبوعہ ۱۸۴۱ء) سے لیے ہیں حقیقت یہ کہ انھیں غالبؔ کے کوائف سے بہت کم واقفیت ہے۔

---

(۷۳)

غالبؔ نامہ۔ نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۸۵ء ص ۳۰ سے

"غالبؔ کا سالِ ولادت"۔۔ از ڈاکٹر حنیف نقوی

(ص ۳۰) ---- بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح کے ایک قصیدے میں انھوں نے (غالبؔ) نے یہ دعوٰے کیا ہے کہ

ہم چوں من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم

نیست در دہر، قلم مدّعی و نکتہ گو است

عام حالات میں اس دعوے کو تعلّی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا لیکن اس قصیدے میں غالبؔ نے سیّاروں کی رفتار اور ان کے اثرات کا جس ماہرانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے وہ علم نجوم سے ان کی کامل واقفیت پر دلالت کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔"

(ص ۳) ۔۔۔۔۔ شواہد کی روشنی میں بجا طور پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالبؔ زائچہ سازی کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ (تاہم ان کے اپنے خود ساختہ زائچے پر) غالبؔ ہی کا یہ تبصرہ لفظ بہ لفظ صادق آتا ہے کہ ع

مگوے زائچہ کایں نسخہ ایست از اسقام ۔۔۔۔۔"

مگر اس علم کے بارے میں خود غالب کا کیا کہنا ہے وہ ان کے خط بنام انور الدولہ سعد الدین خاں شفق مورخہ ۵ نومبر ۱۸۵۸ء سے معلوم ہو سکتا ہے۔ شفق نے پوچھا ہے کہ دنبالہ دار ستارے کا اثر کیا ہوتا ہے۔ غالب جواب میں فرماتے ہیں۔

"اب ۔۔۔۔۔۔ کچھ حال ستارۂ دم دار کا لکھوں ۔۔۔۔۔۔

سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ چونکہ بہ سبب فقدانِ اسباب یعنی رصد و کتاب کچھ نہیں کہا جاتا ہے۔ ناچار مرزا صاحب کا مصرع زبان پر آجاتا ہے ؎

ازیں ستارۂ دنبالہ دار می ترسم

یہ مطلع ہے اور پہلا مصرع ہے ؎

زخالِ گوشۂ ابروے یار می ترسم

کیا آپ مجھ کو بے ہنری اور بے خبری (ہیچ میرزی) میں صاحبِ کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداقِ حال نہیں جانتے۔؟

پیشِ مُلّا طبیب، پیشِ طبیب مُلّا، پیشِ ہیچ ہر دو وپیشِ ہر دو ہیچ[1]۔ آرائش مضامینِ شعر کے واسطے کچھ تصوف، کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔"

عموماً نجومی، رمّال، صوفی وغیرہ ہونے کا دعویٰ کرنے والے لوگ

---

[1] یعنی مُلّا سامنے ہو تو خود تو طبیب بن جاتے ہیں۔ طبیب سامنے ہو تو مُلّا۔ اگر کوئی بالکل ہی ہیچ ہو تو اس کے سامنے ہر فن مولا بن جاتے ہیں یعنی بیک وقت طبیب بھی اور ملّا بھی اور کہیں سچ مچ طبیب اور مُلّا سے واسطہ پڑ جائے تو کورے بن جاتے ہیں (کیونکہ یہی ان کی حقیقت ہے۔ اور غالب کہتے ہیں میں بھی ایسا ہوں)۔

سطحی ہی ہوتے ہیں جو نہیں جانتے مگر شغل کے طور پر ان علوم کو اپنا لیتے ہیں اور ان کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ غالب کا بھی یہ مشغلہ ہی تھا ایسے لوگ کامل ہونے کا دعویٰ کیونکر کر سکتے ہیں۔ ان کے نتائج کو شہادت مان لینا درست نہ ہوگا۔

حالی نے اسی عبارت کا منظوم ترجمہ یوں پیش کیا ہے ؎

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کبھی فن میں کہیں بند نہ اس کو

موجود سخن گو ہو جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو

دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

(مقدمہ مع دیوانِ حالی ۔ مطبع نامی ۱۸۹۳ء)

ص ۳۲ بعنوانِ سخن سازی

(۷۴)

غالب کا علمی سرمایہ ۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن لاہور ۔ فروری ۱۹۸۹ء

"حرفے چند" میں جناب جمیل الدین عالی (ص ۱۵) فرماتے ہیں

" ۱۹۴۲ء میں (میری) عمر تقریباً سترہ برس تھی ...... ایک دن لوہارو کے کتب خانے میں بیٹھا کہ کچھ نظر آئے ...... راقم نے غالب کے کوئی ایک سو بیس ...... خطوط فارسی اور اُردو دو چھوٹی چھوٹی بوریوں میں بند پائے ...... میں سب خط نہ پڑھ سکا ...... ہاں اکثر مطالب صاف سمجھ لیے ......

اُردو کے بیشتر خط غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے چچازاد بھائی اور والئی لوہارو میرے پردادا نواب امین الدین خاں کے نام تھے ...... ان میں اکثر خطوط جوئے والے معاملے سے متعلق تھے ...... جیل کے

بعد سخت برہمی کا اظہار بھی تھا۔ ایک دو میں صاف صاف یہ تھا
کہ تم نے میری خبر خود آکر نہ لی ۔۔۔۔۔۔ ایک میں واضح طور
پر تھا کہ اگر تم بھی ۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ میری سزا کو حق جانتے ہو اور خاندان کے لیے
میری رشتہ داری کو بدنامی کا باعث تو اپنی بہن [امراؤ بیگم]
کو بلا لو ـــــ معلوم ہوتا ہے یہاں سے لکھا گیا کہ اچھا
انھیں بھیج دو۔ ایک فرستادہ کا بھی ذکر تھا۔ غالبؔ کا خط
کہتا ہے کہ تمھارے آدمی خط لے کر آئے، تمھاری بہن جانے
سے انکاری ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ خط ضائع ہو گئے، ضائع نہ ہو گئے ہوتے تو اب تک کسی نہ کسی کو مل جاتے لیکن یہ بات ریکارڈ میں ہے کہ غالبؔ کے وہ خط راقم الحروف نے دیکھے ہیں۔" یہ بات بہت سنجیدہ اور اہم ہے ۔ اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب پتا چلتا ہے کہ وہ خط جو اس بات کے شاہد تھے، اب ضائع ہو چکے ہیں ۔ تاہم عالیؔ صاحب کے بیان کی شہادت خود اردوے معلّیٰ (ص ۴۲۵) پر موجود ہے غالبؔ ۲۳ر اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام علاؤ الدین احمد خاں علائیؔ (عالیؔ صاحب کے دادا) میں لکھتے ہیں:

۔۔۔۔۔ اپنا مقصود تمھارے والد ماجد (نواب امین الدین احمد خاں) سے اور تمھاری جدۂ ماجدہ اور تمھارے عمِّ عالی مقدار (نواب ضیاء الدین احمد خاں) سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچّوں کو کہ یہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو کہ اب میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی بہ شرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا ۔۔۔۔۔۔"

جوئے کے الزام میں غالبؔ دوسری مرتبہ ۲۵ر مئی ۱۸۴۷ء کو گرفتار ہوئے تھے اور جیل میں نظر بند رہے تھے اس لیے یہ حرف امراؤ بیگم کے واپس بھیجنے کی بات ہے مگر دس سال بعد بی بی کے ساتھ دو بچے باقر علی خاں اور

حسین علی خاں پسرانِ عارف .... (وفات اپریل ۱۸۵۲ء) بھی شامل ہو گئے۔

(۷۵)

غالبؔ کے لطیفے از انتظام اللہ شہابی دہلی جون ۷۴ ۱۹ ء

شاعر کے کسی (ہنگامی یا غیر ہنگامی) شعر کو سامنے رکھ کر قصّہ، لطیفہ یا واقعہ گھڑ لینے کا ہمارے بزرگوں کا رجحان بہت پُرانا ہے۔ ان میں خواجہ عشرت لکھنوی اور جنابِ انتظام اللہ شہابی نمایاں نام ہیں۔ مثال کے طور پر (ص ۴۶) ملاحظہ کیجیے۔

"قلعہ میں بادشاہ کی طرف سے شاہی مشاعرہ تھا۔ شہر کے تمام مشاہیر شعراء شریک تھے، صہبائیؔ، ذوقؔ، حالیؔ، معارفؔ، محوؔ، علائیؔ، صابرؔ، نیّرؔ، آزردہؔ، شیفتہؔ وغیرہ، مرزا صاحب (غالبؔ) بھی شامل ہوئے۔ بیٹھتے ہی فرماتے ہیں۔

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے — چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

مرزا نے غزل پڑھی:۔

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کیلئے — رہے نہ طرزِ تبسم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

نواب مصطفےٰ خاں کہتے تھے، ذوقؔ نے اس شعر کی بہت تعریف کی مرزا گھر چلے گئے، تو اسی طرح (میں) حضرت ذوقؔ نے فی البدیہہ غزل مجلس کو سنائی۔

مزے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زباں کیلیے — سو ہم نے دل میں مزے شورشِ نہاں کیلیے
بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلیے "

(۱) سخن کی آزمائش ہے چمن کی آزمائش ہے" یہ غزل ۱۸۵۲ء میں کہی گئی تھی۔

(۲) جہاں کے لیے، آسماں کے لیے۔ یہ طرحی مشاعرہ ۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں نسیمؔ رام پوری مقیم دہلی کے یہاں منعقد ہوا تھا۔ (دیکھیے دیوانِ ذوقؔ مرتبہ آزادؔ اور جلوۂ داغؔ مرتبہ احسن مارہروی) اس میں مومنؔ اور داغؔ بھی موجود تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس غزل یا مشاعرے سے بادشاہ کا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ صریحاً اختراع ہے کہ غالبؔ کی غزل کی بناء پر ذوقؔ نے گھر جا کر اس پر غزل کہی تھی۔ جب مشاعرے کا انعقاد ہی ۱۸۴۵ء میں ہوا تھا، تو سخن کی آزمائش ہے" والی غزل (جو ۱۸۵۲ء میں کہی گئی تھی) سے کوئی شعر کیونکر پڑھا جا سکتا تھا۔ کتاب ایسے اختراعی لطیفوں سے بھری پڑی ہے۔ ذیل کے عنوان جو اس کتاب میں درج ہیں، ایسی ہی داستانیں لیے ہوئے ہیں۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ص ۱۲۔ ستم پیشہ ڈومنی ص ۱۴ بدیہہ گوئی ص ۱۶۔ غالبؔ اور مومنؔ ۴۴۔ اسیرؔ بدایونی ص ۵۲، فقر سلطانی ص ۶۷ کاغذی پیراہن ص ۶۷۔

(۷۶)

ماہنامہ سہیل گیا (بہار) مئی ۱۹۸۹ء ص ۱۴ (اقتباس از مضمون ڈاکٹر رستوگی
"نازشِ ادب کالی داس گپتا رضاؔ" از ڈاکٹر تاراچرن رستوگی دسمبر ۱۹۸۸ء

سہیل ص ۱۴۔

"غالب کے یہاں مانگے کا اجالا بہت ہے، جس پر نہ جانے کیوں غالب شناسی دھیان نہیں دیتی۔ مصرعہ اور شعر اڑا لینا بھی غالب کو خوب آتا ہے۔ مثلاً۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
ہر کہ از بزمِ تو برخواست پریشاں برخواست
(بیدل)

پہلا مصرعہ جوں کا توں اڑاتے ہوئے اور دوسرے مصرع کو فارسی میں ملبوس کرتے ہوئے غالب یوں نغمہ سنج ہوئے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

اور جانکی پرساد سرودؔ کا شعر لے کر غالب نے کیا گل کھلایا دیکھیے ؎

از گرمئ نشاطِ تصوّر کشم سرود
من عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ام

اب غالب کہاں ٹھہرتے ہیں ؎

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

ملحوظ رہے قصبہ فرید پور ضلع بریلی کے قریب کا ساکن سرودؔ فارسی کا بے مثل شاعر گزرا ہے۔ دیوان ۱۸۲۱ء میں مرتّب ہوا اور میری بیاض میں سرودؔ کے ۶، ۷ اشعار درج ہیں۔ بریلی کے معروف محلّہ ملوک پور میں میرا گھر تھا اور ملوک پور سے ملحق محلّہ گڑھیا میں میرے ایک ہم درس گیانند سکسینہ ہوا کرتے تھے۔ گیانند کے ہاں میں نے جے گوپال آنولوی کو بھی دیکھا اور جانکی پرساد کے

بڑے صاحبزادے کے بیٹے جوگیانند کے ماموں تھے سرود کا
دیوان اپنے ساتھ دو تین مرتبہ لائے۔ گیانند کے ماموں جانکی
پرساد صاحب کے پوتے تھے۔۔۔۔۔۔"

نازشِ ادب ص ۶۲ " جانکی پرساد سکسینہ (سرود) ۔۔۔۔۔۔ کی وفات انیسویں صدی کے اواسط میں ہوئی تھی۔۔۔۔۔"

انیسویں صدی کے اواسط سے ۱۸۴۵ء تا ۱۸۵۵ء کی مدت مراد لی جا سکتی ہے۔
گویا جانکی پرساد سکسینہ سرود ساکن قصبہ فریدپور، ضلع بریلی، غالب کے کم و بیش ہم عصر تھے۔ ڈاکٹر رستوگی نے سرود کا دیوانِ فارسی ۱۸۲۱ء کا مرتبہ بتایا ہے۔ اور غالب کی غزل دیوان بخطِ غالب مکتوبہ ۱۸۱۶ء میں موجود ہے۔ مگر اس میں یہ شعر نہیں۔ یہ نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے میں اضافہ ہوا ہے۔ گویا ۱۸۲۱ء کے بعد فکر کیا گیا ہے اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں شامل کیا گیا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ شعر پہلے کس نے فکر کیا۔

پہلا شعر (بوے گل نالۂ دل ۔۔۔۔/ ۔۔۔۔ پریشاں برخاست) کے متعلق عرض ہے کہ یہ مجھے کلیاتِ بیدل میں کہیں نہیں ملا۔

(۷۷)

چمنستانِ جوش۔ دیوان نواب احمد حسن خاں جوش مطبوعہ ۱۲۹۰ھ بارِ دوم مطبع منشی نولکشور

جوش کا یہ دیوان پہلی بار ۱۲۸۷ھ میں چھپا تھا۔ دیوان بارِ دوم کے ص ۱۹۰ پر ایک مخمس درج ہے جو میاں داد خاں سیاح تلمیذ غالب کی غزل پر ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

منور گھر ہے اپنا شمع روسے آج خلوت ہے
جلے کیونکر نہ پروانہ یہ اپنی اپنی قسمت ہے

یہ غزل "میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام" از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی میں شامل ہے

اس لیے یہاں سے حذف کی جاتی ہے مگر ص ۲۲۷ پر سیّاح کا ایک قطعہ تاریخ درج ہے جو شاملِ دیوان نہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

"قطعۂ تاریخ طبع از نتائجِ افکارِ شاعرِ نامدار،
مشہورِ شہر و دیار جناب منشی میاں داد خاں
صاحب متخلص بہ سیّاح ساکن ملک سورت۔

بجو شد طبع سیّاح آں نسخہ
کہ بودہ درو نظم والائے جوشش
تو ناگاہ تاریخِ طبعش سروش
بگفتہ کہ نادر سخنہائے جوشش

۱۲۹۰ھ

(۷۸)

کاشف الحقائق۔ سیّد امداد امام اثرؔ۔ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۲ء

کاشف الحقائق کی پہلی جلد ۱۸۹۷ء میں مطبع سٹار آف انڈیا قصبہ آرا سے شائع ہوئی۔ ذیل کے بیانات جلد دوم میں سے ہیں جو ۱۸۹۷ء کے بعد کارونیشن پریس لکھنؤ سے بہ اہتمام منشی محمد نسیم مالک مطبع، چھپی۔

(ص ۳۴۴) "اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت (غالبؔ) فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہنچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومنؔ نے ان کا تتبع ہونا چاہا۔۔۔
۔۔۔۔۔ مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومنؔ

مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسے ان کا رنگ دیکھا جاتا ہے
اور ہم میر کے رنگ میں در آئے ۔۔۔۔۔۔"

کلیاتِ اشعار ناسخ (۱۲۵۸ھ = ۴۲-۱۸۴۲ء) میں مثنویوں وغیرہ کے علاوہ تین دیوان شامل ہیں۔ دیوانِ اول کی تاریخ ترتیب ۱۲۳۲ھ = ۱۸۱۶/۱۷ء ہے۔ اگر یہ دیوان ترتیب ہونے کے ساتھ ہی دہلی آگیا ہو تو اس وقت غالب کی عمر لگ بھگ ۲۰ سال اور مومن کی عمر بھی سترہ سال کی ہوگی مگر ایسی کوئی شہادت ہمارے پاس موجود نہیں کہ ۔۔۔۔ دیوانِ ناسخ پہلے پہل ۱۸۱۶/۱۷ء یا اس کے آس پاس دہلی پہنچا ہو۔ ہاں اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ کلام ناسخ ۱۸۱۶/۱۷ء سے پہلے اور بعد میں بھی یقیناً دہلی پہنچتا رہا تھا۔ اور اس کا اتباع بھی ہو رہا تھا۔ البتہ ۳۵/۱۸۳۴ء کے خطِ غالب بنام ناسخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے اپنا دیوان غالب کو بھیجا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ غالب نے اس بات کا اقرار کیا ہو کہ مشقِ سخن کے زمانے میں انھوں نے اور مومن نے ناسخ کے اسلوب کی پیروی کی کوشش کی تھی۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ صاحبِ کاشف الحقائق نے بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم یہ غلط نہیں کہ کلام غالب کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ناسخ سے مل جاتے ہیں۔ اور غالب کا یہ کہنا کہ "ہم میر کے رنگ میں در آئے" ایسا دعویٰ ہے جو غالب کے شایانِ شان نہیں۔ وہ ایک حد تک میر کے معتقد تھے مگر میر کے مقلد نہ تھے۔

(۷۹)

نیا دور لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۹۰ء مضمون میر انیس از دانش لکھنوی

ریاض الدین امجد سندیلوی نے ۶ محرم ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ھ کو غالب سے ملاقات کی تھی۔ وہ اپنے سفر نامے سرورِ ریاض میں لکھتے ہیں

"پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ

رہتے تھے، گیا، مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا
.... مرزا نے تین بند مرثیے کے اپنی تصنیف
کے سنائے لوگ رو رو کے پیٹے چلائے۔ وہ بند میں نے
طلب کیے۔ مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر دیے...
......مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ
گوئی میں فوق لے گیا ہے۔ ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔

تذکرۂ جلوہ خضر میں صفیر بلگرامی نے لکھا ہے کہ وہ ۱۲۸۲ھ (مطابق ۶۶-۱۸۶۵ء) میں غالب سے بغرض ملاقات دہلی گئے تھے۔

"ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے کہ
میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا۔ تین بند کہہ کر دیکھا،
تو واسوخت ہو گیا، وہ بند یہ ہیں..... پھر فرمایا واقعی
یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں
اٹھا سکتا۔"

حالی نے بھی یادگارِ غالب میں اس کا ذکر کیا ہے مگر انیس اور دبیر دونوں کا نام لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایک بار غالباً مجتہد العصر سیّد محمد صاحب مرحوم و مغفور
نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اردو میں جناب
سیدالشہداء کا مرثیہ لکھیں چونکہ مرزا ان کی بہت
تعظیم کرتے تھے اور ان کے سوال کو رد کرنا نہیں
چاہتے تھے، ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مرثیہ
لکھنے بیٹھے، چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔
اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حدِ
کمال تک پہنچا چکے تھے اور قوا میں انحطاط شروع
ہو گیا تھا، بمشکل سے مسدس کے تین بند لکھے،

جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے ۔۔۔۔۔ ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیے اور صاف لکھ بھیجا کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لیے لکھے ہیں، ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ ان لوگوں کا حصّہ ہے، جنہوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو ان کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔ ان کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیسؔ اور دبیرؔ جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہو گا۔"

مندرجۂ بالا سے ظاہر ہے کہ غالبؔ نے مرثیہ گوئی میں دبیرؔ کو تو مسلم الثبوت مرثیہ گو مانا مگر انیسؔ کا سوائے حالیؔ کے مجہول سے بیان کے کہیں نام نہیں لیا اگرچہ انیس کے قلم سے غالبؔ کی وفات پر کہی ہوئی ایک رباعی ملتی ہے اب نیا دور میں جناب دانشؔ لکھنوی نے لکھا ہے (ص ۱۵)

میرؔ انیس اور مرزا غالبؔ

میر انیسؔ اور مرزا غالبؔ میں براہِ راست خط و کتابت نہ تھی۔ مگر میرؔ انیسؔ کے ہم عصر اور دوست جناب مفتی میر عبّاس شوستری سے مرزا صاحب کی مراسلت رہتی تھی۔ ان خطوط کی کیفیت سے میر انیسؔ بھی لطف اٹھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا غالبؔ نے مرثیہ کہنے کی کوشش کی اور چند بند کہہ کر مولانا سیّد محمّد صاحب مجتہد العصر (رضواں مآب) کو لکھنؤ روانہ کیے میر انیسؔ کے لیے مرزا غالبؔ کا قول تھا کہ " ہندوستان میں انیسؔ جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے

(حاشیہ صفحہ ۱۸۱ پر دیکھیے)

نہ آئندہ ہوگا۔ مرزا غالبؔ کا حیاتِ انیسؔ میں ۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ کو انتقال ہوا۔ میر انیسؔ نے باقاعدہ کسی مرثیے میں ان کی وفات کا حال تو نظم نہ کیا البتہ ایک رباعی ضرور کہی جو درج ذیل ہے۔

گلزارِ دو جہاں سے باغِ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مداحِ علی کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے "

انیسؔ کے لیے دانشؔ صاحب کا پورا بیان ثبوت کا محتاج ہے اور غالبؔ کی تاریخ وفات بھی ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ ہے نہ کہ ۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ

(۸۰)

سعادت الکونین فی فضائل الحسنین از مفتی محمد اکرام الدین اکمل الاخبار دہلی ۱۳۱۰ھ

کتاب کے مصنف مفتی محمد اکرام الدین نبیرۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ہیں۔ اور اس کا ترجمہ اُردو میں مولوی حافظ محمد رحیم بخش نے کیا تھا اور وہی پیشِ نظر ہے۔ اس کے ص ۱۹۹ پر طالبؔ تلمیذِ غالبؔ دہلوی کے دو قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ۱۸۰ کا) سلہ یہ حالیؔ کا قول ہے انھوں نے صرف انیسؔ اور دبیرؔ لکھا ہے۔ دانشؔ صاحب نے دبیرؔ کا نام قصداً حذف کر دیا۔ تاہم یہ ماننا مشکل ہے کہ مرثیہ گوئی میں غالبؔ، انیسؔ کے مقام سے واقف بھی نہ تھے۔ شاید طبعاً دبیرؔ انھیں زیادہ پسند ہوں گے۔

"قطعۂ تاریخ از سخنور بے مثال شاعر نازک خیال افتخار الشعراء عالی جناب فیض مآب جناب نواب سعید الدین احمد خاں صاحب بہادر طالبؔ رئیس و جاگیردار لوہارو"

جو اس کتاب میں لکھا ہے حال اماموں کا
جزائے خیر مؤلّف کو دے خدائے کریم
مجھے خیال جو تاریخ کا ہوا طالبؔ
کہا یہ پیرِ خرد نے، ملا ہے اجرِ عظیم

۱۳۱۰ھ

ایضاً

جس نے دیکھی کتاب یہ طالبؔ
اس نے گلشن بتولؑ کا دیکھا
لکھ یہ تاریخ از سرِ برکت
ذکر آلِ رسولؐ کا دیکھا

(۸۱)

مہذّب اللغات جلد ہفتم - ۱۹۷۰ء ص ۳۵۰

"صُوَر: (بہ ضمِ اوّل و فتح دوم) صورت کی جمع۔۔۔

ہے منحصر نمودِ صُور بر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قولِ فیصل: یہ لفظ اردو کے لیے بہت غریب اور غیر مانوس ہے لیکن اضافی حالت میں جب بصورت مضاف آتا ہے تو غرابت قدرے کم

ہو جاتی ہے ؎

ذہن میں سب مرے حاضر صُوَرِ علمیّہ
پر جتانا نہ تھی منظور مجھے علمیّت (ذوق)

غالبؔ کے یہاں مضاف الیہ کی صورت میں آیا ہے
(نمودِ صُوَر) یعنی آخر میں صُوَر رہ جاتا ہے جو سُوَر کی طرف
ذہن کو منتقل کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سُوَر ایک غلیظ
کھانے والا اور قابلِ نفرت جانور ہے ۔۔۔۔۔۔"

صاحبِ مہذّب اللّغات دُور کی کوڑی لائے ہیں۔ یہ شعر غالبؔ کے اچھّے شعروں میں شمار ہوتا ہے۔ شعر میں تمثیل سے غرض یہ ہے کہ "ممکنات کی ہستی کو وجودِ واجب کے ضمن میں ثابت کیا جائے۔"

مولانا حالؔی فرماتے ہیں:

" (یہ شعر) وحدتِ وجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔
قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام
محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ وہاں کیا دھرا ہے،
انتہائے بلاغت ہے ــــــ"

(۸۲)

غالبؔ کی فارسی مثنوی چراغِ دَیر ۔۔۔ مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۴ء اختر حسن

(ص ۲۲) "لکھنؤ میں تقریباً نو مہینے قیام رہا"

بعض ماہرینِ غالبیات نے غالبؔ کے لکھنؤ میں قیام کی مدّت ۱۱ ماہ سے پندرہ ماہ لکھی ہے۔ خود غالبؔ نے، ابنِ حسن خاں کے نام کے خط (مطبوعہ اردو ادب۔ علی گڑھ شمارہ ۳/۴ ۱۹۵۲ء) میں "کما بیش پنج ماہ" لکھی ہے۔ تاہم ڈاکٹر حنیف نقوی نے دلائل سے طے کیا ہے کہ لکھنؤ میں غالبؔ کے

قیام کی مدت اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۸۲۶ء تا ۲۱ جون ۱۸۲۷ء قرار پاتی ہے "، یعنی تقریباً آٹھ ماہ۔ یہ مدت جناب اختر حسن کے حوالے سے اوپر بیان کی گئی "قریباً نو مہینے" کی مدت سے بہت قریب ہے مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ جناب اختر حسن "قریباً نو مہینے" کی مدت کے فیصلے پر کیونکر پہنچے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ غالبؔ نے یہ مدت لکھنؤ میں کیونکر گزاری۔

میں نے جب اپنی کتاب غالبؔ درونِ خانہ کے لیئے کلکتہ کے سفر کی توقیت" تیار کی تو اس میں ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کے مضمون سے بھی بہت سا استفادہ کیا۔[1] ڈاکٹر صاحب کا مضمون غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے مجلّہ غالبؔ نامہ بابت جنوری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

(۸۳)

تلاشِ غالبؔ از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مطبوعہ مئی ۱۹۶۹ء

جنابِ شمس الرحمان فاروقی اپنی کتاب "تفہیم غالبؔ" (مطبوعہ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۔ ص ۱۶) میں فرماتے ہیں

"درگا پرشاد نادرؔ کے شاگرد حلمؔ دہلوی نے اپنی ایک کتاب میں غالبؔ کے ۴۷ اشعار کی شرح کی ہے۔ اس کتاب کا مفصل تعارف نثار احمد فاروقی نے اپنی گراں قدر تصنیف "تلاشِ غالبؔ" میں درج کیا ہے۔ ان ہی کی عنایت سے یہ کتاب مجھے بھی دیکھنے کو ملی ...."

پھر فٹ نوٹ میں درج کرتے ہیں

---

[1] میں نے اس توقیت کو دوبارہ تیار کیا ہے اور کئی دوسرے ماخذوں سے اس میں بہت سے اضافے کیے ہیں۔ یہ کبھی آئندہ شائع کی جائے گی۔

"بعض وجوہ کی بنا پر میں اس کتاب کو درگا پرشاد نادر دہلوی
کی تصنیف نہیں سمجھتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تلاشِ غالب ص ۳۲ پر جناب نثار احمد فاروقی کے مضمون کا عنوان ہے

"کلامِ غالب کا ایک ہم عصر شارح
درگا پرشاد نادر دہلوی"

مضمون ص ۲۳۳ سے ص ۲۶۲ تک پھیلا ہوا ہے چونکہ اشعارِ غالب کی شرح ص ۲۳۸ سے شروع ہوتی ہے اس لیے پہلے چھ صفحات ہی ہیں جو حقیقت میں فاروقی (نثار احمد) صاحب کے قلم سے ہیں اور بہت مفید ہیں۔ تاہم ان کی دو باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

(اوّل) مضمون کا عنوان اور کتاب کا مؤلف

(دوم) کتاب کا قیاسی نام 'چار چمن'

'تلاشِ غالب' میں درج ہے

(ص ۲۳۳) "کلامِ غالب کا ایک ہم عصر شارح درگا پرشاد نادر دہلوی"

(ص ۲۳۴) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیسری معاصر شخصیت درگا پرشاد نادر دہلوی
کی ہے جسے اس مضمون میں پہلی بار شارحِ کلامِ غالب کی
حیثیت سے روشناس کرایا جا رہا ہے"

(ص ۲۳۶) "نادر ہی کی ایک تصنیف کا مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کے
ذخیرے میں ہے جن کے ابتدائی دو صفحات اور سرورق
غائب ہے۔ آخر سے کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔ بظاہر اس
کتاب کا نام چار چمن ہے"

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ کتاب جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو جناب نثار احمد فاروقی "کی عنایت سے ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھنے کو ملی" تھی۔ اور اس کے مطالعے سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کتاب نادر کی نہیں بلکہ ان کے شاگرد حلم دہلوی کی تالیف ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی عنایت کردہ کتاب "تفہیمِ غالب" پڑھ کر میں نے

جناب نثار احمد فاروقی سے یہ کتاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے فوراً کرم فرمایا اور وہ کتاب میرے مطالعے کے لیے ارسال فرما دی۔ اب اس کے اور نادر کی کتاب خزینۃ العلوم کے مطالعے سے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

پہلے خزینۃ العلوم ص ۲۵۱/۲۵۰ کا یہ اقتباس دیکھیے:

"تاریخ۔ منظومۂ شیریں زبان۔ فصیح دوراں۔ خوش گپ۔ مولوی شیخ عبداللہ صاحب بن شیخ غلام رسول صاحب متوطن قصبہ ساڈھورہ ضلع انبالہ متخلص بہ حلمؔ سابق طالب علم نورمل سکول دہلی حال نائب اوّل مدرسہ موہرنندہ واقع ضلع مذکورہ۔ جس کے ایک ہی مصرع سے سنین عیسوی و ہجری کس خوبصورتی سے نکلتے ہیں کہ جس کا ثانی ہونا معلوم۔ اس پر طرّہ یہ کہ مصرع کے الفاظ و معنی کی خوش اسلوبی بھی قابلِ دید ہے۔ اللہ جل شانہ اس نو مشق کو مرادِ دلی فائز کرے۔

کیا چھپی عمدہ مرے استاد نادر کی کتاب
مچ رہی ہے جس کی لکھنؤ غرب سے تا شرق دھوم

کر دیا ہے آنکھ کے تل میں فلک کو جیسے بند
مشتری جس پر پھریں پیا گھومتے باندھے قدوم

جس زمیں میں شعر یہ کہتے ہیں فخرِ شاعراں
آسماں تعظیم سے لے ہے اُسے آنکھوں سے چوم

آسمانِ شاعری کے آپ ہیں مہرِ منیر
شاعرانِ ہند میں پرتو سے رخشاں جوں نجوم

حلقۂ سیارگاں ہوتا ہے جوں مہر پر محیط
شاعروں کا اس طرح رہتا ہے گرد ان کے ہجوم

محفلوں میں جب کبھی ان کے شعر کا آتا ہے ذکر
بس برس جاتا ہے گویا ابرِ معنی جھوم جھوم

شوق تھا یہ شاعری میں کون سی سیکھوں کتاب
جس سے آ جائیں مجھے اس علم کے طرز و رسوم

بحکاملِ شعراں کا جب سے زہرہ نے سُنا
ناچتی پھرتی ہے حالت میں فلک پر گھوم گھوم

عیسوی مصرع میں ہجری کہ صلاح ہاتف نے دی
حلمؔ تو پنجی لگا کر پڑھ خزینۃ العلوم

یعنی اعداد کل مصرع ۱۸۷۹ء ہیں اور خزینۃ العلوم + ۴ × حی = ۱۲۴۴ = ۴ × ۱۳ =

۴۴ ۱۲+ ۵۲ = ۹۰ ۱۲ھ نکلے۔ اسی کا نام صنعتِ حسابیہ ہے۔"

اب کتاب زیرِ بحث کے پہلے چمن کے خاتمے پر حلمؔ کے قطعے کا عنوان دیکھیے:

"تاریخِ کتاب ہٰذا بطورِ اختصار قطعہ مندرجۂ کتاب ہٰذا صفحہ ۲۵۱ حلمؔ مؤلف شاگردِ مصنّف موصوف"

یہاں کتاب ہٰذا سے مراد خزینۃ العلوم ہے۔ یعنی حلمؔ مؤلف [کتاب زیرِ بحث]، کہ کتاب ہٰذا [خزینۃ العلوم] کے مصنّف [نادرؔ] کا شاگرد ہے، کا قطعۂ تاریخ مندرجۂ [خزینۃ العلوم] ص ۲۵۱، اختصار کے ساتھ اس کتاب [زیرِ بحث] میں درج کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خزینۃ العلوم میں اس قطعے کے ۹ شعر ہیں مگر کتاب [زیرِ بحث] میں صرف پانچ ہی شعر دیے گئے ہیں۔ چار شعر (چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں) حذف کیے گئے ہیں۔ گویا قطعے کو مختصر کر کے چھاپا گیا ہے۔

کتاب ہٰذا سے مراد خزینۃ العلوم اس لیے بھی ثابت ہے کہ کتاب [زیرِ بحث] کے حلمؔ کے قطعے کے فوراً پہلے میر مقصود علی رفعؔ دہلوی کا قطعہ تاریخ ہے جس کا عنوان ہے:

"تاریخ تالیفِ خزینۃ العلوم مصنّف
لالہ درگا پرشاد نادرؔ دہلوی"

لہٰذا اس قطعے کے بعد قطعۂ تاریخ میں کتاب ہٰذا سے مراد کتاب خزینۃ العلوم ہی ہے۔

مندرجہ بالا سے ثابت ہے کہ کتاب زیرِ بحث، (اس کا جو بھی نام ہو) درگا پرشاد نادرؔ دہلوی کی نہیں بلکہ مولوی شیخ عبداللہ حلمؔ دہلوی شاگرد درگا پرشاد نادرؔ دہلوی کی تالیف ہے۔

کتاب زیرِ بحث کے پہلے دو صفحے غائب ہیں تیسرے صفحے پر لوح کی شروع کی عبارت یہ ہے۔

"[پہلے چمن ......] گل کھلا رہی ہے۔ دوسرے چمن کو اشعارِ محاورہ کی نسیم مہکا رہی ہے۔ تیسرے چمن میں ضرب الامثال کی صبا سیر دکھا رہی ہے۔"

اسکے بعد پہلا چمن شروع ہوجاتا ہے۔ گویا کتاب تین چمنوں ہی پر محیط ہے۔ اس لیے اس کا نام "سہ چمن" تو ہو سکتا ہے "چہار چمن" نہیں۔
ظاہر ہے کتاب میں غالب کے اشعار کی شرح علم کا نتیجۂ فکر ہے جو ۱۸۷۹ء میں، خزینتہ العلوم کی تصنیف کے وقت، ابھی نو مشق تھے۔ بمشکل پچیس سال کی عمر کے۔

(۸۴)

خدا بخش لائبریری جرنل ۵۷۔۶۲ جنوری تا جون ۱۹۹۱ء ص ۲۴۲

میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں کہ یہ کہنا درست نہیں کہ غالب سہرے کی صنف کے موجد ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ذوق نے سہرا غالب کے سہرے کے بعد کہا ہے مگر یہ عین ممکن ہے کہ عیش کا سہرا غالب کے سہرے سے پہلے کا کہا ہوا ہو۔ بہر حال قاضی عبدالودود مرحوم کا یہ بیان درج بالا حوالے کے ساتھ نوٹ کیے جانے کے قابل ہے۔

فرماتے ہیں

"۔۔۔۔۔۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کا سہرا جو ان کی مثنوی تاریخ زیبا میں ہے، غالب کے سہرے سے بہت پہلے کا ہے۔ گویہ قریب بہ **یقین** ہے کہ غالب کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ عاشق نے سہرا کہا تھا ـــــــــــــــ"

قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "بعض اصحاب سہرے کو مستقل صنفِ سخن ۔۔۔ ۔۔۔ قرار دیتے ہیں۔ غالب کا سہرا جو دیوانِ اردو میں ہے غزلوں سے الگ بھی ہے لیکن غالب نے کلیاتِ نثر میں اسے 'غزل' کہا ہے (ص ۲۲۵)"

کلّیات میں حکیم آغا جان عیش نے سہرے کو حصّۂ غزلیات ہی میں شامل کیا تھا مگر اب کلّیاتِ عیش (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) میں اسے دانستہ علٰحدہ صنفِ سخن کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

(۸۵)

دیوانِ زکی (تلمیذِ غالب) در مطبع رضوی دہلی ـ ۱۸۹۵ء

زکی نواب سید محمد زکریا خاں رضوی دہلوی (۱۸۳۹ء تا ۴ ـ ۳ ـ ۱۹۰۳ء) کا یہ دیوان ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ مطابق ماہ جون ۱۸۹۵ء میں چھپ کر شائع ہوا تھا ـ اس کے آخر میں چار قطعہ ہائے تاریخ درج ہیں ـ تیسرا قطعہ درج کیا جاتا ہے ـ

قطعہ تاریخ طبعزادِ مولوی علی احمد خاں اسیر بدایونی

صورت نگارِ معنی مثلِ زکی نہ باشد	جانِ کلیم و طالب، روح و روانِ غالب
آبِ حیات تازہ، معجز اثر کلامش	زندہ از و بہ گیتی نام و نشانِ غالب
نعلش بہ خویش نازد از شانِ میرزائی	دیوانِ او سراپا گویا زبانِ غالب
در فکرِ سالِ طبعش بودم اسیر حیراں	گفتہ بگوش ہاتف طرزِ بیانِ غالب
	۱۳۱۲ھ

پیش لفظ (ص ۳) میں زکی لکھتے ہیں :

"..... سخن گزار سید محمد زکریا رضوی دہلوی کہ خلف سید محمود خاں صاحب محمود مرحوم و نبیرہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں صاحب بہادر معظم جنگ سرور مغفور است"

آگے چل کر "غدر" کے متعلق اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "نواب نجم الدولہ، دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر نظام جنگ مبرور" اور میرے بزرگوں میں "روابطِ دوستی و یکجہتی" تھے، اس سبب میں بھی دس بارہ سال کی عمر میں اُن (غالب) کا "آستانہ بوس" بن گیا ـ اور فنِ سخن گوئی میں شرفِ شاگردی حاصل کیا ـ چنانچہ ان کی زندگی تک ان کا کاسہ لیس رہا ـ

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ شاگردوں نے زکیؔ کے شاگردِ غالبؔ ہونے میں شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں (ص ۵ و ۶) کہ وہ لوگ جو استاد (غالبؔ) کے روشناس بھی نہیں یا بہت کم عرصے سے ہیں یے استاد کی خدمت بجا لا سکے، انھوں نے اشتباہِ عام پیدا کر دیا۔ لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں شاگردوں کے زمرے میں شامل ہونے سے پہلے ہی "آستانۂ حضرتِ استاد" کو بوسہ دینے جایا کرتا تھا۔ اور "شرفِ حضوری" حاصل کرتا تھا۔ (اسی بات کی تصدیق کے لیے) جناب استاد (غالبؔ) نے مجھے اردو زبان میں ایک سارٹیفکٹ عطا فرمایا، جس کی نقل یہاں دی جاتی ہے۔

اب غالبؔ کا سارٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیے۔

"سبحان اللہ سارٹیفکٹ لکھنے کا کس وقت میں اتفاق ہوا ہے کہ میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ مہیا بھرے غذا بالکل مفقود، صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے[1] اگر اٹھوں تو دورانِ سر سے گر پڑوں۔

سیّد محمد زکریا خاں نسب میں سیّد میرزادۂ عالی دودمان، ان کے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے ہیں۔ جاگیر اب تک تھی۔ پھر بعوض جاگیر پنسن[2] مقرّر ہوا۔ لہٰذا یہ شخص بذاتِ خود نیک اور صاحبِ علم اور متواضع اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگین طبع، معنی سے طبیعت کو علاقہ اچھا ہے شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اس فن میں میرے شاگردِ رشید ہیں۔

اسد اللہ خاں غالبؔ

محمد اللہ ۱۲۳۸ اسد اللہ خاں

---

[1] اصل میں یہاں "اٹھنا دشوار" کا اضافہ ہے۔

[2] اصل "پنشن"

سارٹیفکٹ بخطِ غالب کا عکس رسالہ "ادیب" الٰہ آباد کے فروری ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ۱۲۳۸ھ والی مہر سے مراد غالب کی تیسری مہر ہے جو انھوں نے ۲۳-۱۸۲۲ء میں بنوائی تھی۔ یہ بہت زمانہ استعمال میں رہی (یوں بھی سند کے لیے کوئی سی بھی مہر ثبت کی جا سکتی ہے) تاہم اس کے بعد اور مہریں بھی بنیں۔ لیکن ۱۲۳۸ھ والی مہر سے زمانۂ تحریر کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ تحریر غالب کے بالکل آخری زمانے کی ہے۔ اگر تحریر کے وقت زکی ۲۸-۲۹ سال کے بھی ہوں تو بھی اس کا زمانہ ۶۸-۱۸۶۷ کے پہلے کا نہ ہوگا۔

(۸۶)

مخزن شعراء یعنی تذکرۂ شعرائے گجرات از قاضی نورالدین حسین خاں فائق مرحوم مرتبہ مولوی عبدالحق۔ مطبوعہ ۱۹۳۳ء

قاضی نورالدین حسین خاں فائق اور غالب ہم عصر تھے۔ غالب کا انتقال ۱۲۸۵ھ میں ہوا۔ اور فائق کا ۱۲۸۶ھ میں۔ فائق نے تذکرۂ مخزن شعراء کا مسودہ شہاب الدین احمد خاں ثاقب (۱۸۴۰ء تا ۱۸۶۹ء) کی معرفت غالب کی خدمت میں بھیجا۔ غالباً اس درخواست کے ساتھ کہ اس پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ غالب نے اس کے جواب میں جو خط لکھا ہے وہ اس تذکرے کے ص ۱۱۹ پر درج ہے ملاحظہ کیجیے۔

"عبارتے کہ جناب اسد اللہ خاں صاحب بعد مطالعۂ ایں
اوراق و اصلاح آں تحریر فرمودہ برائے یادگارے
تحریر می شود"

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نورالدین حسین خاں بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خاں بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دیے۔ نظم سے

میں نے بالکل قطعِ نظر کی۔ کاملؔ صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے اس کو بھی نہیں دیکھا۔ صرف آپ کی نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا۔ بعض موقع پر منشائے اصلاح بھی لکھا دیا ہے۔ مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں بمضمونِ الامر فوق الادب حکم بجا لایا ہوں۔ مرحبا آفریں بخدا خوب نثر لکھی ہے اللہ سبحانہٗ آپ کو مدارجِ اعلیٰ کو پہنچادے اور سلامت رکھے۔

مرقومہ دوشنبہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ء

خوشنودیِ احباب کا طالب

غالبؔ"

(۸۷)

اعمال نامہ۔ سر سیّد رضا علی۔ طبع اوّل دسمبر ۱۹۴۳ء

(ص ۲۴) "مولوی ہدایت علی ایک نامور بزرگ تھے۔ جن کا زمانہ آج سے سوسوا سو برس پہلے تھا۔ عربی کے جیّد عالم اور فارسی کے اچھے انشا پرداز تھے۔ خوش فکر شاعر تھے۔ تمکینؔ تخلص تھا۔ شعر فارسی میں کہتے تھے۔ ان کا ضخیم فارسی دیوان خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اور میں نے اشعار کا انتخاب اصل دیوان سے کیا ہے افسوس ہے کہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بزرگوں کے ادبی ذخیروں کے تحفظ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو طبع کرا دیا جائے ورنہ وہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ

نہیں رہ سکتے۔ مولوی صاحب عرصہ تک منصف رہے۔ پنشن لینے کے بعد کندرکھی میں رہتے تھے۔ اور علمی اور ادبی مشاغل میں ان کا وقت گزرتا تھا۔ فارسی شعراء کے کلام کا انتخاب چار ضخیم جلدوں میں خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ کتاب کا نام "ہدایت الشعراء" ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ چاروں جلدیں اس وقت تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر اشاعت کا انتظام جلد نہ ہوا تو تلف ہوجائیں گی۔ فارسی شعراء و اساتذہ کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب کرنا موجودہ زمانہ میں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ آج سے سوا سو برس پہلے چھپی ہوئی کتابیں بہت کم ملتی تھیں۔ اس زمانہ میں شعرائے ایران و ہند کا کلام بہم پہنچانا بجائے خود نہایت دقت طلب تھا۔ مگر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ مولوی ہدایت علی کا انتخاب معمولی انتخاب نہیں ہے بلکہ موصوف نے تمام تر التزام رکھا ہے کہ مشہور فارسی جملوں، محاوروں اور مخصوص طرز ادا کے متعلق اساتذہ نے جو جو اشعار لکھے ہیں اور استعارے باندھے ہیں یا تشبیہیں دی ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ ان چاروں جلدوں میں سے ایک جلد میری نظر سے گزری ہے۔ پرانے بانس کے کاغذ پر جو اپنی پائداری کے لیے مشہور ہے۔ یہ جلد جس میں چھ سو چالیس صفحے ہیں اوّل سے آخر تک ایک قلم اور روشنائی کی لکھی ہوئی ہے۔ صرف ایک صفحہ پر جو میں نے اچانک کھولا۔ جن شاعروں کا کلام درج تھا ان کے نام یہ ہیں۔ انوری، مولانا روم، شوکت، کمال خجند، حافظ، سلمان، صائب، شفائی، عرفی، وحید، محتشم، ہاتفی، کاتبی، جامی، نمونہ کے طور پر موصوف کے دیوان سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

رنگ و بوی باز و گل و گلزار پیشِ روئے تو
نیستد یجا یار گر رشکِ چمن گویم ترا

گرچہ صائب غزلے گفت ازیں بہ نمکین
غزلے بہتر ازیں در ہمہ دیوان تو نیست

بر زمیں از دودِ آہم آسمانِ دیگرست
از غبارِ خاطرِ من سایہ بانِ دیگرست

قاصدش پیغامِ صلح آورد و من بوسم لبش
زانکہ ایں پیغام شیریں از زبانِ دیگرست

آں صیدِ خلق گردد و ما صیدِ چشم تو
نسبت چساں دہیم بہ چشمت غزالہ را

غالب کا اعتراض تمکین پر

مولوی ہدایت علی اس پایہ کے شاعر تھے کہ غالب نے اپنے ایک خط[1] میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مرزا سے ہندی شاعر کے کلامِ فارسی کے بارے میں کلمۂ خیر کی توقع رکھنا ایسی ہی بعید از قیاس ہے جیسا راجہ اندر کا پریوں کے اکھاڑے میں اہنسا پر وعظ دینے کے لیے مہاتما گاندھی کو مدعو کرنا۔ مرزا کسی ہندی شاعر کے فارسی کلام کو قابلِ سند نہ سمجھتے تھے۔ اس کلیّہ میں انھوں نے صرف دو مستثنیات قرار دیے تھے۔ ایک امیر خسرو اور دوسرے وہ خود۔ چودھری عبدالغفور سرؔور کے نام ایک خط[2] میں فرماتے ہیں "بہرحال حضرت کو یہ معلوم ہے کہ میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرؔو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائبؔ و کلیمؔ و اسیرؔ و حزیںؔ کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔"

حد سے بڑھی ہوئی خودستائی کے باعث مرزا چاروں طرف سے حریفوں اور رقیبوں کے نرغے میں آ گئے۔ کلکتّہ میں اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ خود دہلی میں ان پر چوٹیں ہونے لگیں۔ جن حضرات نے برہانِ قاطع کو مرتّب کیا یہ سمجھنا چاہیے کہ مرزا کے مقابلہ کے لیے انھوں نے حریفوں کی فوج آراستہ کی تھی مرزا نے قاطع برہان لکھ کر حریفوں کے وار کو نہ صرف رد کیا بلکہ غنیم کے لشکر میں گھس کر اپنے حملوں کی تیزی کو اور بڑھا دیا۔ معلوم ہوتا ہے اس جنگ میں مولوی ہدایت علی تمکینؔ نے مرزا کے مخالفوں کا ساتھ دیا۔ مرزا کی ذہنیت یہ تھی کہ ان کے عقیدت مندوں کا ان کی خدمت میں عرض کرنا کہ۔ مصرعہ

---

[1] دیکھو ادبی خطوطِ غالب۔ مرتبہ مرزا محمد عسکری بی۔ اے۔ مطبعہ انوار المطابع لکھنؤ ص ۸۶
[2] ایضاً ص ۱۷

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

کافی نہ تھا۔ بلکہ مرزا سے اظہارِ عقیدت کے ساتھ ان کے حریفوں کو لچر اور پوچ
کہنا بھی ہر فارسی داں کا مرزا کی نظر میں فرض تھا۔ یہ بڑا سخت امتحان تھا۔ جس میں
گنے چنے عقیدت کیشوں کے سوا اور کوئی پورا نہ اترتا۔ تمکینؔ کے بارے میں
مرزا لکھتے ہیں۔ "مولوی ہدایت علی تمکینؔ کا آج تک میں نے نام نہیں سنا تھا،
چھپے ہوئے رستم ہیں۔ صائبؔ اگرچہ اصفہانی نژاد تھا۔ مگر وارِد شاہ جہاں آباد تھا
انتقام کشیدن و انتقام گرفتن دونوں بول گیا۔ مولوی صاحب لچر فارسی بولتے ہیں۔
"لاحول ولاقوۃ الا باللہ"۔ یہ عجب لطف ہے کہ صائبؔ کو مرزا مسلّم الثبوت شاعر
بھی مانتے ہیں اور انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن کے بارہ میں تعریض بھی کرتے
ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ برہان قاطع کے ترتیب دینے والوں نے دونوں محاوروں
کو صحیح مانا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ مرزا نے مصرعہ۔ باطل است آنچہ مدّعی گوید۔
پر عمل کیا اور تنہا تمکینؔ کی ہی خبر نہیں لی۔ بلکہ صائبؔ پر بھی اعتراض جڑ دیا۔ اگر ہندوستان
آنے کے قصور میں صائبؔ درجہ استادی سے گر گئے تو پھر معقولیت اور مذاق سلیم،
زبان دانی کا تاج ان بزرگوں کے سر پر کس طرح رکھ سکتے ہیں جو مرزا کی طرح ہندوستان
میں پیدا ہوئے پلے بڑھے۔ جن کی ساری تعلیم ہندوستان میں ہوئی اور جن کو
ایران کی بجائے کبھی خلیج ایران کے درشن بھی میسر نہیں ہوئے۔ مرزا خفگی میں جو چاہیں
فرمائیں، انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں کی سند صائبؔ کے علاوہ اور ایرانی
اساتذہ کے کلام میں بھی موجود ہے۔

شعر۔
انتقام خویش خونِ بے گناہاں می کشد
نیستم آگہ کہ بعد از من چہ بر قاتل گذشت (سلیم)

شعر۔
نیکی برائے اہلِ کرم چوں قبول نیست
نتواں ز خصمِ خویش گرفت انتقامِ خویش (طاہر وحید)

شعر۔ انتقام از خصم نگرفتن صفائے باطن ست
صقیلِ آئینہ باشد دل زکیں برداشتن (مفید بلخی)

فرہنگ آنند راج میں انتقام کے تحت لکھا ہے
"کینہ کشیدن از کسے و با لفظ کشیدن و
گرفتن مستعمل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"
اور مثال میں درج بالا سلیم اور مُلّا مفید بلخی کے دو شعر دیے ہیں۔ مفید بلخی کے شعر کے مصرعۂ اولےٰ میں "صفائے باطن" کی جگہ "صفائے سینہ" درج ہے۔ غالب کا اعتراض بہر حال درست نہ تھا۔ فرہنگ آنند راج میں یہ بہارِ عجم کے حوالے سے ہے اور غالب بہارِ عجم سے ناواقف نہ تھے۔

(۸۸)

اعمال نامہ۔ سر سیّد رضا علی طبع اوّل دسمبر ۱۹۴۳ء

"غالب کی قدر مرنے کے بعد"

غالب کو وہ مرتبہ اپنی زندگی میں نہ ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے۔ خواجو اپنے زمانہ میں فارسی داں دنیا پر ایسے چھائے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ان کا طوطی صدیوں بولے گا۔ خود حافظ نے ان کا تذکرہ بڑے ادب سے کیا ہے اور اپنے کلام میں خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ مگر آج خواجو کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ برخلاف اس کے ہر دل میں حافظ شیرازی کی جگہ ہے اور ہر لب پر ان کے اشعار ہیں۔ غالب کی قدر ہوئی مگر ان کے مرنے کے بعد۔ اب ان کو قبر میں چین کی نیند آئی ہوگی اور غالباً اپنا یہ شعر بھول گئے ہوں گے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بعض اوقات شاعروں کی وجدانی عالم کی پیشین گوئیاں بھی پوری ہوئی ہیں۔ اسی ذیل میں غالبؔ کے اس فارسی شعر کو شمار کرنا چاہیے۔ شعر

قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

ترجمہ۔ میرے اشعار کی قدر میرے بعد ہوگی۔ اس وقت خریداروں کا اس قدر قحط ہے کہ میرے کلام کی شراب جب پرانی ہو جائے گی تب دنیا کو اس کا مزہ آئے گا (پہلا مصرعہ اصل میں یوں ہے ۔ شہرتِ شعرم بہ گیتی ِرضا)

یہ سب تو ہوا مگر میرے نزدیک دو آدمیوں کے ساتھ زمانہ نے ان کی حیثیت سے کم درجہ کا سلوک کیا۔ مرثیہ گو شعراء میں علم و فضل کے اعتبار سے دبیرؔ کا درجہ بہت بلند ہے۔ شوکتِ الفاظ کے باعث کلام میں عجب زور پیدا ہو گیا ہے۔ مضامین کی آمد کیا ہے دریا موجیں مار رہا ہے۔ ان کی قوتِ متخیلہ نے بڑے انوکھے استعارے اور نازک تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ ان استعاروں اور تشبیہوں نے ان کی مضمون آفرینی میں عجب بہار پیدا کر دی ہے۔ دوسرا شاعر جس کو دنیا نے انجمنِ سخن میں اب تک وہ جگہ نہیں دی جس کا وہ مستحق تھا مومنؔ ہے۔"

غالب، مومنؔ، انیسؔ اور دبیرؔ ہم عصر تھے۔ مگر مرثیہ گوئی میں غالبؔ نے دبیرؔ کو مانا اور کہیں انیسؔ کا نام نہیں لیا حالانکہ انیسؔ نے دبیرؔ سے بہت زیادہ شہرت پائی۔ غالبؔ اور مومنؔ میں اچھے روابط تھے۔ انھوں نے مومنؔ کا ذکر ہر جگہ احترام سے کیا ہے۔

اب حالات پلٹ چکے ہیں اور دبیرؔ اور مومنؔ وہ شہرت پا رہے ہیں جس کے وہ مستحق تھے۔

(۸۹)

کلیاتِ نظمِ حالی از افتخار احمد صدیقی۔ مجلس ترقیٔ ادب لاہور۔ جولائی ۱۹۶۸ء

۱۔ خمسۂ نعتیہ[1]

(ص ۲۸۷)"

(۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء)

مرحبا زیب دہِ مسند عالی نسبی
مرحبا صاحب اورنگِ شفاعت طلبی
مرحبا سرورِ دیں ہاشمی و مطلبی
"مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی"

---

[1] شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اس نظم کے تعارف میں لکھتے ہیں:
"قدسی کی مشہور و معروف نعتیہ غزل پر سیکڑوں اشخاص نے تضمینیں کہی ہیں۔ اس قسم کی بہت سی نظمیں قاضی محمد عمر صاحب، ساکن ضلع مظفر نگر نے جمع کیں اور ۱۲۷۲ھ میں حدیثِ قدسی کے نام سے انھیں شائع کیا۔ اس میں مولانا کے نام سے مندرجۂ ذیل نظم کتاب کے صفحہ ۲۳ پر لکھی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میں تخلص بجائے حالی کے "خستہ" ہے۔ اب یہ معلوم اس وقت مولانا کا تخلص ہی عام طور پر خستہ تھا یا اس خاص نظم میں مولانا نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا۔ بہر حال یہ یقین ہے کہ یہ نظم مولانا ہی کی ہے، کسی اور کی نہیں۔۔۔"
(جواہرات حالی۔ صفحہ ۸۹)

تعجب ہے کہ شیخ صاحب نے خستہ تخلص کے بارے میں تو شبہ ظاہر فرمایا لیکن تضمین کے متعلق ان کا دعوٰی یہ ہے کہ "یہ نظم مولانا ہی کی ہے"۔ حالانکہ یہ دعوٰی بے دلیل ہے۔ دیگر مصنفوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی اس تضمین کے حوالے سے حالی کے، ابتداءً خستہ تخلص اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو "حالی بحیثیت شاعر"۲۵

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۸ سے آگے)
"یادگارِ حالی" صفحہ ۳۰، "حالی کا ذہنی ارتقا" صفحہ ۱۱۔ لیکن میری رائے میں اس تضمین اور خستہ تخلص کا مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ حالی کے اپنے بیانات یا معاصر تصانیف سے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے کبھی خستہ تخلص اختیار کیا تھا۔

"حدیث قدسی" ۱۸۵۶ء میں مرتب ہوئی۔ حالی ۵۵۔۱۸۵۴ء میں ڈیڑھ برس تک دہلی میں رہے۔ یہ ابتدائی مشقِ سخن کا زمانہ تھا۔ خود حالی کا بیان ہے کہ "اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا" (ترجمۂ حالی) علاوہ ازیں انھوں نے اپنے پہلے قصیدۂ نعتیہ، مرتبہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء (ع بجتے ہیں مدحتِ سلطان دوجہاں کے لیے") کے حاشیے میں یہ صراحت لکھا ہے کہ: "اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا"۔ لہٰذا اس تضمین کو حالی سے منسوب کرنے کا بہ ظاہر کوئی جواز نہیں۔ لیکن چونکہ اس کے خلاف بھی کوئی حتمی دلیل نہیں ملتی اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے کلیات میں شامل کیا جائے۔

(ص ۲۸۹)

"خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصفِ نبی
ہاتھ اٹھا سوئے مدینہ دمِ حاجت طلبی
پڑھ زباں سے زرہِ صدق یہ شعرِ قدسی
"سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی"

میں عرض کرتا ہوں کہ "حدیثِ قدسی" پہلے پہل ۳ صفر ۱۲۷۱ھ (۲۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء) کو شائع ہوئی تھی اور ترتیب دو سال پہلے یعنی ۱۲۶۹ھ میں دی جا چکی تھی۔ حالی پہلے پہل ۵۵۔۱۸۵۴ء میں بغرضِ تعلیم دہلی آئے تھے۔ اس وقت ان کی

عمر ۱۶ - ۱۷ کی تھی ۔ لہٰذا حدیثِ قدسی میں (جو خمسہائے غزل قدسی یا چمنِ مدحِ نبی کے نام سے چھپی تھی) ان کی شمولیت ممکن نہ تھی ۔ لیکن جب "حدیثِ قدسی" ۱۲۷۹ھ (۶۳ - ۱۸۶۲ء) والا ایڈیشن طبع ہوا تو اس میں ایک خمسہ ذیل کے عنوان سے بھی درج ہوا ۔

"خمسہ حافظ الطاف حسین صاحب
رئیس پانی پت تخلص خستہ"

اس خمسے کو نام (الطاف حسین) اور مقام (پانی پت) کی وجہ سے، حالی کا فکر کردہ قرار دیا جاتا ہے ۔ اس بات کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ پچیس چھبیس سالہ حالی کو کوئی جھوٹے منہ بھی رئیس ۔ نہیں کہہ سکتا ۔ تلامذۂ غالب میں جنابِ مالک رام کی زبانی ان کی "ریاست" کا حال سنیے

"(حالی) کے والد خواجہ ایزد بخش نے ۔۔۔۔۔۔۔ ساری عمر عسیر الحالی میں بسر کر دی ۔ یہ (حالی) نو برس کے تھے جب ان (والد) کا بعمر ۴۰ برس انتقال ہو گیا ۔۔۔۔۔"

دوسرے یہ کہ "خستہ" کو فارسی داں فاع کے وزن پر لانا ہی فصیح سمجھیں گے ۔ نہ کہ فعلن کے وزن پر ۔ اس خمسے میں بھی ع خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصف نبی میں خستہ کو بروزن فاع ہی رکھا گیا ہے ۔ حالی کا وزن فعلن ہے ۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں تاہم عموماً شاعر اپنے پرانے تخلص کو تبدیل کرتے وقت ہم وزن لفظ ہی کا انتخاب کرتے ہیں ۔

تیسرے یہ بھی ہے کہ اگر یہ خمسہ حالی کا کہا ہوا تھا تو انھیں اسے اپنے کلام میں باقاعدہ شامل کرنے میں کیا چیز مانع تھی ۔

میری رائے میں اس خمسے کا حالی سے کوئی تعلق نہیں ۔

(۹۰)

رسالۂ شطرنج ملقب بہ ہشت ثمنہ از درگا پرشاد نادر۔ مطبوعہ دہلی

(تاریخِ اتمام ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء)

تلامذۂ غالب بارِ دوم ص ۲۲۴ پر جناب مالک رام لکھتے ہیں

"...... ریورنڈ وہٹلی صاحب جب دہلی آ گئے تو انھوں نے شہر کے ان اصحاب سے راہ و رسم پیدا کی، جنھیں شطرنج سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کے بعد ایک شطرنج سوسائٹی (یا جلسۂ شطرنج) کی بنا ڈالی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بلاناغہ بروز دوشنبہ مغرب کے بعد سوسائٹی کا جلسہ ہوا کرے گا۔ یہ جلسے علائی (نواب علاؤ الدین احمد خاں شاگردِ غالب) کے مکان (بلی ماراں) میں ہوا کرتے تھے...."

اوپر درجِ عنوان رسالۂ شطرنج کے ص ۳ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ درگا پرشاد نادر، مصنف رسالہ (ولادت ۲۱ دسمبر ۱۸۳۴ء تلمیذ امام بخش صہبائی) جو خود اس عہد سے تعلق رکھتے تھے، لکھتے ہیں

"اگر سرکاری مدرسوں میں اس (شطرنج) کی تعلیم بھی ہوا کرے تو نازیبا نہیں ہے جیسے انگریزی کرکٹ یعنی گیند کا کھیل بڑے بڑے اسکولوں میں سکھایا جاتا ہے۔ باآنکہ اس کے واسطے کوئی کلب جاری رہے جیسا پچھلے دنوں ۱۸۶۶ء میں جناب پادری ریورنڈ وہٹلی صاحب بہادر نے میرزا علاؤ الدین احمد خاں صاحب بہادر والیٔ ریاست لوہارو دام اقبالہٗ کے مکان پر جلسہ شطرنج کا مقرر فرمایا تھا..........."

جناب مالک رام نے یہ معلومات غالباً رسالہ بساطِ فرنگ سے حاصل کی تھیں کیونکہ ان کے حوالے کی کتابوں میں یہ رسالہ شامل ہے۔ نادر نے بھی آغازِ رسالۂ شطرنج میں ان کا ذکر یوں کیا ہے

"۔۔۔۔۔ دریں والا یعنی ۱۸۷۱ء میں تین رسالہ[1] شطرنج ۔۔۔۔۔ درگا پرشاد نادر ۔۔۔۔۔ بن منشی منسا رام ناتواں کھتری دہلوی کی نظر سے گزرے ۔۔۔۔۔ دل میں آیا کہ تو بھی اس میدان میں ہاتھ پیر ہلا ۔۔۔۔۔ بس یہ رسالہ ہشت تمنہ تیار ہوا ۔۔۔۔۔۔۔"

(۹۱)

اُردو صحافت کی تاریخ از نادر علی خاں۔ اشاعت ۱۹۸۷ء

"جذبۂ انتقام میں انسانی قدریں پامال ہو جاتی ہیں اور ہوش مند انسان بھی بغض و حسد کا شکار ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کی مے نوشی اور قمار بازی بھی رنگ لائی۔ موصوف نہ صرف قید و بند کی سختیاں انگیز کرنے پر مجبور کیے گئے بلکہ معاصرین کے جذبۂ انتقام کا بھی نشانہ بنے۔ مولوی محمد باقر جو شیخ ابراہیم ذوق کے ثنا خوان اور ہوا خواہ تھے مرزا غالب کی گرفتاری پر جوشِ مسرت اور جذبۂ انتقام

---

[1] ایک رسالہ شطرنج مرتبہ میر عباس بن میر غلام علی بمحاورۂ اُردو قدیم و دیگرے بزبانِ فارسی محررہ جناب منشی سلطان سنگھ صاحب کھتری دہلوی جو راے آنند رام مخلص کے خاندان میں ہیں اور راج الور کے معزز اہلکاروں میں سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرا رسالہ مولفۂ میرزا شمشاد علی بیگ صاحب رضوان موسومہ بساطِ فرنگ انگریزی طور کے نقشوں میں ۔۔۔۔۔۔"

سے مست و سرشار ہو گئے اور مرزا صاحب موصوف کے خلاف قدرت استدلال واظہار کے خوب جوہر دکھائے اور مرزا غالب قیدِ بامشقت سے نہ بچ سکے ۔

"قمار بازاں"

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے ، مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب و کثرتِ مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانہ دار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے یہ پہلے جمعدار تھا بہت مدت کا ذکر ہے جمعداری میں یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے ، بہت بے طمع ہے ۔

یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ میں سے ہے یقین ہے کہ تھانہ دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی اور سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا سب کو گرفتار کیا عدالت سے جرمانہ علی اقدر مراتب ہوا مرزا نوشہ پر سو روپے ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانہ دار کی خدا خیر کرے دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو مگر حکام ایسے تھانہ دار کو چاہئے کہ بہت عزیز رکھیں ۔ ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے ۔"

(دہلی اردو اخبار ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء)"

مؤلفِ کتاب نے محض غالب اور ذوق کی روایتی چشمک کے زیرِ اثر ایسے سخت ریمارکس چسپاں کر دیے ورنہ اخبار میں چھپی خبر سے کوئی یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ غالب کی قمار بازی اور گرفتاری کی خبر دیتے ہوئے مولوی محمد باقر کسی قسم کے "بغض و حسد کا شکار" ہو گئے تھے۔ دیانتدار حاکم کی طرفداری بُری بات نہیں۔

کتاب مذکور کے اندراجات سے ذوق اور ان کے اکلوتے بیٹے شیخ محمد اسماعیل (فوق) کے حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

(ص ۱۲۶)

"یکم جولائی ۱۸۴۴ء کے سراج الاخبار سے بہادر شاہ ظفر اور حضرت ذوق مرحوم کے باہمی تعلقات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔"

"حضور را رعایت و پرورشِ سہ کس بہ نظر قدامت اوشاں بدل منظور است اگر کسے از طرف آناں چیزے عرض معروضہ خواہد نمود بپایہ عنایت سامی خود (کرم خورد) نام ہر سہ ندیم الدولہ حافظ محمد داؤد خان بہادر سلطان الشعراء محمد ابراہیم خاں ذوق و میر جلال الدین خوشنویس بر زبان معجز بیان گذشت۔"

سراج الاخبار کے مطالعے سے ایک اور اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ سلطان الشعراء حضرت ذوق مرحوم ہی دربار شاہی کے ملازم نہیں تھے بلکہ موصوف کے فرزند ارجمند جناب شیخ محمد اسماعیل خاں بھی زمرۂ ملازمین میں داخل تھے اور وقار الدولہ کے خطاب سے سرفراز تھے۔

"حسب الحکم اقدس تنخواہ باغبانانِ علاقہ بر جبرو کہ بتوقار الدولہ محمد اسمٰعیل خان بہادر و تنخواہ کبوتر بازان علاقہ مذکورہ میر ببر علی خاں کوکلتاش حوالہ نمود۔

(سراج الاخبار مطبوعہ یکم جولائی ۱۸۴۴ء)

شاہ دہلی کو یقیناً استاد ذوق سے روحانی اور قلبی تعلق تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ موصوف نہ صرف استاد ذوق کو عزیز رکھتے تھے بلکہ صاحب زادے موصوف کو بھی مقررہ تنخواہ کے علاوہ خاص خاص تقاریب میں عطیات شاہی سے بھی سرفراز فرماتے تھے۔

"چوں دریں ولا تقریب کتخدائی دختر وقار الدولہ شیخ محمد اسمٰعیل خان بہادر خلف سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم خان بہادر متخلص بہ ذوق بہ روے کار است اسمی ظفر الدولہ علی اصغر خاں بہادر براے عطاے مبلغ دو صد روپیہ فرمانِ واجب الاذعان شرف نفاذ یافت۔

(ص ۲۲۵) "دیوانِ تفتہ"

"ان دنوں دیوان تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہ دیوان تفتہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۶ء میں دیا گیا تھا بسبب عدیم الفرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔ شعراے متاخرین میں ایسا فارسی کلام کسی کا کم دیکھنے میں آیا۔ اس کی فصاحت کے اعتبار سے اگر تفتہ کو صائب وقت اور اس کے وطن سکندر آباد کو اصفہان کہیے تو بجا ہے۔ اور اس کا چھاپا اس کیفیت سے ہوتا ہے کہ ولایتی لیٹر کا غذ نہایت شفاف و آبدار اور اکیس سطر کا صفحہ بخطِ نستعلیق بہ قلم متوسط لکھا جاتا ہے اس کی ضخامت ۲۵ جزو سے زیادہ ہوگی۔ اور اشعار پندرہ ہزار سے زیادہ ہیں۔ اس کی قیمت بالفعل چار روپے ہیں اور آج سے دو مہینے کے بعد چار روپے آٹھ آنے اور پھر دو مہینے کے بعد پانچ روپے

ہوجائیں گے درخواست مع قیمت کے اس مطبع میں بھیج دیں۔
دیوان موصوف بعد اختتام طبع بہ سبیل ڈاک بہ صیغۂ
بیرنگ بھیجی جائے گی اور اس دیوان میں ہر غزل دو غزلہ
ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے

ساقی بیار مے کہ من تفتہ ام کنوں نوابِ عہد بہ خویشم و باخانم آشنا

(اسعد الاخبار شمارہ نمبر ۸۱) "

اسعد الاخبار آگرہ سے ۷ جون ۱۸۴۷ء کو جاری کیا گیا تھا۔ ہفتہ وار نکلتا تھا۔
ظاہر ہے کہ شمارہ نمبر ۸۱ کا مطلب آخر ۱۸۴۸ء یا آغاز ۱۸۴۹ء ہوا۔ جس دیوان کا یہاں
ذکر ہے وہ منشی ہرگوپال تفتہ تلمیذ غالب کا دیوانِ اوّل ہے جو ۱۸۴۹ء میں شائع
ہوا تھا۔ اس کا آج تک صرف ایک ناقص مطبوعہ نسخہ معلوم ہے جو ردیف (م) تک ہے۔ پہلے
آخری حصّہ ضائع ہو چکا ہے اور ہارڈنگ لائبریری دہلی میں موجود ہے۔

(ص ۲۹۶)

" منشی ہرسکھ رائے ایک باذوق اور جہاندیدہ صحافی تھے۔
انھوں نے اپنے اخبار کو صرف خبروں ہی کا مرقع نہیں بنایا،
بلکہ نظم و نثر کے شہ پاروں سے اسے رنگین ادبی گلدستہ میں
بدل دیا۔ اخبار مذکور میں صرف اردو شعراء کی غزلیں اور
قصائد ہی شائع نہ ہوتے تھے بلکہ منشی ہرگوپال تفتہ ایسے
نغز گو فارسی شعراء کی غزلیں بھی چھپتی تھیں۔ ۵ رجون ۱۸۵۱ء کے
اخبار میں تفتہ کی جو غزل شائع کی گئی تھی اس کا مطلع ہے۔

غم بدل، خوں در جگر، سودا بسر دارم بیا دادا از دستِ تو اے بیداد گر دارم بیا "

یہ غزل تفتہ کے دیوانِ دوم کے ص ۹ پر درج ہے۔ کل شعر ۱۱ ہیں اور یہ اسیر
کی اس غزل پر کہی گئی ہے جس کا مطلع ہے ؎

تفتہ سامانِ نومیدی از حد رفت می آئی اگر پیش ازاں کز رہگذارت دیدہ بردارم بیا

یہ دیوان ۱۸۵۷ء میں مطبع کوہِ نور لاہور سے شائع ہوا تھا۔

(۹۲)

دیوانِ جلال اسمِ تاریخی شاہدِ شوخ طبع۔ مطبع انوارِ محمدی لکھنؤ۔ ص ۲۷۵

" قطعۂ تاریخ ختمِ کتاب۔ مؤلفۂ شفیقی محمد احسن اللہ خاں
ثاقب شاگردِ حضرتِ غالب دہلوی۔ موسوم بہ 'سبعہ سیارہ'

احسن اللہ خان ثاقب نام این تالیف کرد
با فروغِ فکرِ صائب سبعۂ سیّارہٗ
سالِ ختمش گفت کلکِ معنی آرائے جلال
جلوہ گر از اوجِ ثاقب سبعۂ سیّارہٗ "

۱۲۹۶ھ = ۱۸۷۹ء

جلال لکھنوی ۱۲۸۱ھ (فروری ۱۸۶۵ء) میں نواب یوسف علی خاں کی طلبی پر رام پور گئے تھے اور ثاقب ۱۸۸۷ء (۵-۱۳۰۴ھ) میں ملازم ہو کر گئے تھے۔ لیکن وہ اس سے پہلے بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے جیسا کہ مکاتیبِ امیر مینائی مؤلفہ ثاقب کے ایک حاشیے سے پتا چلتا ہے۔ لکھتے ہیں " راقم (ثاقب) ۱۸۷۰ء میں جب رام پور گیا تھا ...... " جلال اُسی زمانے سے انھیں جانتے ہوں گے جبھی تو ثاقب کی کتاب 'سبعہ سیّارہ' کی تاریخ کہی مگر اس کی ایک تاریخ امیر مینائی نے بھی کہی تھی سے

رقم زد حضرتِ ثاقب کتابے جامع و نادر
دبیرِ آسماں ہم چوں امیر از مدحِ او قاصر
چو گیرد اوّل و آخر کسے از سبعہ سیّارہ
اگر نافہم نبود سالِ تاریخش شود ظاہر

امیر مینائی نے اس سے ۱۲۹۷ھ مستخرج کیا ہے مگر وہ "سبعہ سیّارہ" کی

اس املا سے نہیں نکل سکتا۔ اسے "سبع سیّارا" کہنا پڑے گا۔ یعنی اگر کوئی "سبع سیّارا" کے اوّل آخر اور "ظاہر" کے اعداد شمار کرے تو مطلوبہ سال برآمد ہوگا

سبع کا اوّل آخر = س ع / ۶۰ ۷۰ = ۱۳۰

سیّارا کا اول آخر = س ا / ۶۰ ۱ = ۶۱

ظاہر = ۱۱۰۶ = ۱۱۰۶

۱۲۹۷ھ = (۱۸۸۰ء)

مکتوبات امیر مینائی کے ایک اور حاشیے میں ثاقب لکھتے ہیں کہ

"میری شاعری کی ابتدا جناب قبلہ حضرت محسن کاکوروی کی خدمت میں ہوئی پھر جب میں ۱۸۸۷ء میں ملازم ہو کر رام پور گیا تو حسب فرمائش جناب محسنؔ، چند اردو غزلیں اور ایک یا دو فارسی نظم جناب منشی (امیرؔ) صاحب مرحوم کو دکھلانے کا اتّفاق ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تو کیا ۱۸۸۷ء سے پہلے یا ۱۸۶۵ء میں جب غالبؔ چندے رام پور میں رہے تھے ثاقبؔ نے غالبؔ سے بھی استفادہ کیا تھا؟ جلالؔ لکھنوی کے قطعۂ تاریخ کے عنوان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے اگرچہ خود ثاقبؔ نے اس کا اقرار کہیں نہیں کیا سوائے اس کے کہ ان کی فارسی نثری کتاب "دو دِ بے آتش" غالبؔ کی دستنبو کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ اور دستنبو ہی کی طرح "فارسی نا آمیختہ عربی" ہے۔

(۹۳)

چند ادبی مشاہیر کی تحریریں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری مطبوعہ ۱۹۹۳ء

(ص ۵۹) "۔ ۔ ۔ مرزا غالبؔ بھی دربار [رام پور] کے وظیفہ خوار تھے ایک مرتبہ حکیم [میر ضامن علی جلالؔ] صاحب۔ مرزا سے ملنے

گئے۔ مرزا اس وقت شراب نوشی میں معروف تھے۔ ایک جام حکیم صاحب کے سامنے بھی پیش کیا۔ انھوں نے کہا، 'میں نہیں پیتا ہوں'۔ مرزا صاحب نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا 'آج تو ابر ہے'۔ جلال نے پھر انکار کیا۔ غالب نے کہا 'ابر بھی ہے اور سردی بھی ہے'، آخر جلال نے جھلا کر کہا 'میں حرام جانتا ہوں'۔ اُس وقت غالب مسکرائے اور بولے کہ 'پھر یہ شعر آپ نے کیوں کر کہا

رات مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی "

جلال پہلے پہل فروری ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کی طلبی پر رام پور گئے تھے اور ایک مدت تک وہیں رہے تھے۔ غالب دوسری بار ۱۲/ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے تھے اور ۲۸/ دسمبر ۱۸۶۵ء تک وہاں رہے تھے۔ اگر درج بالا واقعہ ہوا ہوگا تو وہ ۱۲/ اکتوبر ۱۸۶۵ء اور ۲۸/ دسمبر ۱۸۶۵ء کے درمیان ہی ہوا ہوگا۔

لیکن یہ غزل جلال کے پہلے دیوان "شاہدِ شوخ طبع" (=۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) میں موجود نہیں اور دوسرے دیوان "کرشمہ گاہِ سخن" (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء) میں شامل ہے اور یہ غزل مع شعر رندکے رند رہے ۔۔۔۔۔ اس کے ص ۱۲۹ پر موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جلال نے یہ غزل ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۴ء کے مابین کہی تھی جبکہ غالب ۱۸۶۹ء میں انتقال کر چکے تھے۔

واقعہ محض شعر کی ہیئت دیکھ کر گھڑ لیا گیا ہے۔

(۹۴)

مُتفرّق قطعاتِ تاریخ | یہ قطعات ان شاعروں کے فکر کردہ ہیں جو غالب یا ذوق کے شاگرد تھے۔ اس لیے براہِ راست ان کا غالب سے کوئی تعلق نہیں مگر 'غالبیات' سے کچھ نہ کچھ علاقہ ہے۔ اس لیے انھیں یہاں ایک ساتھ ہی درج کر دیا گیا ہے۔

(۱) "ثمرۂ فصاحت" دیوان مولوی فیاض الدین صاحب فیاض۔ ۱۳۱۶ھ

"قطعۂ تاریخ از ۔۔۔۔۔۔۔ جناب ظہیر الدین ظہیر دہلوی

ہوا مطبوع لو الحمد للہ — پھلا پھولا ہے کیا بُستانِ فیاض
ظہیر آئی ندائے ہاتفِ غیب — کہ ہو نے فیض ہے دیوانِ فیاض"
۱۳۱۶ھ

راقم الدولہ سید محمد ظہیر الدین خاں عرف نواب مرزا ۱۸۲۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انتقال حیدر آباد میں ۲۱ مارچ ۱۹۱۱ء کو ہوا۔ ذوق کے برگزیدہ شاگردوں میں تھے۔

(۲) دیوانِ فدا باسم تاریخی پری خانہ محبت ۱۳۱۸ھ۔ افضل المطابع دہلی مصنفہ ریاض الدین احمد فدا اکبر آبادی۔

(الف) ص ۱۲۵ "جناب خواجہ قمر الدین خاں صاحب دہلوی نبیرۂ حضرت غالب مغفور۔

آپ کا حضرتِ فدا دیواں — کیسا اللہ با بلاغت ہے
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ — ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کیا ہی دیواں ہے حضرت راقم — گویا اک دفترِ سلامت ہے
۱۳۱۸ھ

(ب) ص ۱۲۶ " ۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ — ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
مضموں میں ہے ہر رنگ بنا شمعِ شبستاں — تاریخ بھی راقم کہو تم نظم دل افروز"
۱۳۱۸ھ

خواجہ میرزا قمر الدین راقم دہلوی ولد خواجہ امان شاگرد غالب ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور انتقال مارچ ۱۹۱۰ء میں جے پور میں ہوا۔

(ج) ص ۱۳۸ "سید ظہیر الدین حسین صاحب دہلوی شاگرد رشید حضرتِ ذوق مرحوم

مرے مخلص ریاض الدین احمد — قدیمی یادگارِ بزمِ احباب
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ — ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
ظہیر اس کی یہی کافی ہے توصیف — کہ دیوانِ فدا ہے نغز و نایاب

ولہٗ

صد شکر چھپا فدا کا دیواں — بدلی سی ہوا ہے مجھ پہ ظاہر
تھی مجھ کو تلاش فکر تاریخ — بولا یہ سروش ۔ نغز و نادر

(۳) غنچہ مراد ۔ دیوان وفا ۔ مصنف محمد فصیح اللہ وفا ۔ مطبع یوسفی پریس ۔ ۱۹۱۱ء

"تاریخِ وفات مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم دہلوی

(۱) ص ۱۱۴ غالبِ نامور زدارِ فنا — بسوئے خلد گشت راہ گرائے

گفت ہاتف بہ سالِ تاریخش — بلبلِ گلشنِ سخن صد وائے

دیگر در زبر و بینہ منقوط

بپا کیوں نہ محشر ہو پھر چار سُو — ارم کو سِدھارے غالبِ دہلوی

وفا نے لکھا مصرعۂ سالِ فوت — زمانے سے نازک خیالی اٹھی"

(۹۵)

گلدستۂ سخن ۔ آگرہ " در مطبع مفیدِ عام آگرہ باہتمام احمد خاں صوفی طبع گردید"

(بابت ماہ دسمبر ۱۸۸۲ء ص ۱۳)

"غزل از تصنیف جناب
مرزا سعید الدین احمد صاحب طالبؔ
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

مطبعِ اہلِ نظر سیب ذقن ہے کس کا — جو کہ ہے اور نہیں ہے وہ دہن ہے کس کا
عیش سے عمر کے ایام بسر کر غافل — تو ہی جب ہیچ ہے پھر رنج و محن ہے کس کا

لالہ و گل کی نمائش پہ نہ بھولے بلبل — اک سرا ہے چمنِ دہر وطن ہے کس کا
محتسب مست ہوا دیکھ کے چشمِ مخمور — ایسا عالم میں قدح توبہ شکن ہے کس کا
دل شکن توبہ شکن تاب گسل ہوش ربا — زلفِ مہجاں کے سوا اور شکن ہے کس کا
زلف رخسار پہ چھوڑی تو پکاری مخلوق — دیکھنا آج لبِ بام گہن ہے کس کا
دیدہ و دل سے نمایاں ہیں عجب لالہ و گل — باغباں کون ہے اس کا یہ چمن ہے کس کا
عشق کی چال میں آکر ہوئے تم بھی پامال — کیا نہ سمجھے تھے کہ یہ چرخ کہن ہے کس کا
ننگ زندوں سے تنگ کو بہت ہے دیکھیں — شافع روزِ جزا شاہِ زمن ہے کس کا
لوٹ جائے جو سُنے شعر بجز طالب کے — ایسا آفت کا بھرا اور سخن ہے کس کا

(بابت ماہ رمضان مطابق اگست ۱۸۸۳ء) ص ۴۵

"غزل مولوی سعید الدین احمد صاحب طالب
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔ کرنال

انداز ہے یہ بھی مگر اک اس کی ادا کا — لینے نہیں دیتا جو مجھے نام جفا کا
یاں طائرِ جاں سینکڑوں پھنستے ہیں خود اکثر — دلکش ہے عجب دام تری زلفِ دوتا کا
مشکل سے جگہ پائیں گے زہاد جناں میں — پورا مجھے گر اجر ملا پاسِ وفا کا
کیا تیر تمہارا لبِ معشوق نہ ہوتا — قائل دلِ مضطر ہے مگر اپنی خطا کا
کچھ دور نہیں راہ رَو و محملِ لیلےٰ — ہے دشت میں غل چار طرف بانگِ درا کا
غرفہ ہی سے جھانکو کہیں پردہ ہی میں بولو — لب تشنہ ہوں دیدار کا بھوکا ہوں صدا کا
طالب مرے مرقد پہ نہ کیوں آکے دو روئے — کشتہ ہوں دمِ خنجرِ تسلیم و رضا کا

طالبؔ تلمیذِ غالبؔ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ، رخشاںؔ (تلمیذِ غالب) کے دوسرے بیٹے یعنی مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ (تلمیذِ غالبؔ) کے چھوٹے بھائی تھے۔ تلامذۂ غالبؔ (ص ۳۶۲) میں لکھا ہے کہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بھرتی ہو کر ۱۸۸۰ء میں مستقل ہو گئے تھے۔ اور کچھ دن کرنال میں رہے۔ اس گلدستے سے ثابت ہوا کہ وہ ۱۸۸۳ء میں کرنال میں اس عہدے پر متعین تھے۔ بروز یکشنبہ ۳۱ اگست

۱۹۱۹ء ... کو انتقال کیا"۔ دیوان شائع نہیں ہوا مگر قلمی نسخہ "کتب خانہ رضائیہ رام پور میں محفوظ ہے"۔ معلوم نہیں یہ دو غزلیں اس میں شامل ہیں کہ نہیں۔ تاہم یہاں درج کردی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تیس سال کی عمر یا اس سے پہلے کا کہا ہوا کلام ہے۔ کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

(۹۶)

خدا بخش لائبریری جرنل ۷۵-۷۷ پٹنہ - میں شامل کتاب "سکوں پر اشعار" از سید نور محمد اکیلوی

(ص ۱۰۵) "جدوجہد آزادی [۱۸۵۷ء] کے دوران مجاہدین نے بہادر شاہ کے نام سے مخصوص اشرفیاں مضروب کروائی تھیں جن پر مندرجۂ ذیل شعر درج تھا ؎

بزر زد سکۂ نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شاہ غازی

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شعر مرزا غالب نے کہا تھا ...."

یہ بات مصنف نے چراغ دہلی مصنفہ میرزا حیرت دہلوی مطبوعہ کرزن پریس دہلی دسمبر ۱۹۰۳ء ص ۲۴۲ کے حوالے سے لکھی ہے۔ مگر "چراغ دہلی" کی عبارت صرف اتنی ہے

" قدرت اللہ خاں رسالہ دار جو سپاہیوں کے ساتھ اودھ کے رسالوں کی جانب سے یہ درخواست لایا تھا اُسے بخت خاں نے بادشاہ کے روبرو پیش کیا۔ اس نے بادشاہ کے نام کا نیا سکہ نذر کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی "سراج الدین بہادر شاہ غازی نے

سونے کا سکّہ بیادگار فتح تیار کرایا،،

یہ سکّہ ہرگز غالبؔ کا کہا ہوا نہیں ہے۔

(ص ۱۰۶) " جب انگریزوں نے اپنے مخالفین اور بہادر شاہ کے مؤیدین کے خلاف تحقیقات کا آغاز کیا تو مرزا غالبؔ سے بھی باز پرس ہوئی اور دار الضرب سے مرزا غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ شعر [سکّہ] مجسٹریٹ نے ان کے سامنے رکھ دیا۔ اب مرزا کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور " نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، والی کیفیت پیدا ہوگئی۔ مرزا نے نہایت معصومانہ انداز میں یہ اعتراف کیا کہ

' میں نے سکّہ کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا'،،

اگر مؤلفِ مقالہ سیّد نور محمد اکیلوی کہیں اس زمانے میں ہوتے اور انگریزوں کی طرف سے وکالت کرتے تو غالبؔ کے لیے سزائے موت یقینی تھی۔ اکیلوی صاحب کو معلوم ہی نہیں کہ اس سکّے (شعر) پر اعتراض تھا ہی نہیں۔ وہ سکّہ (شعر) جن کی فکر کا غالبؔ پر الزام تھا، یہ تھا۔

بزر زد سکّہ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

اور یہ بھی غالبؔ کا کہا ہوا نہیں تھا تاہم یہ درست ہے کہ غالبؔ زندگی میں اس الزام سے سرخرو نہ ہو سکے، حتیٰ کہ غالبؔ کے انتقال سے لگ بھگ سو برس بعد جنابِ مالک رام مرحوم نے دریافت کیا کہ یہ سکّہ دیران شاگردِ ذوق کا ہے اور صادق الاخبار دہلی کے ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء) کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

مقالہ نگار آگے چل کر لکھتے ہیں:

" بہادر شاہ ظفرؔ کے سکوّں پر فارسی اشعار کے

علاوہ مندرجہ ذیل اُردو اشعار بھی پلٹے گئے ہیں

چلنے اشرفیِ آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے اس پہ جو یہ نہ ہو تحریر

ابوظفر شہِ والا گہر بہادر شاہ
سراج دینِ نبی سایۂ خدائے قدیر

جہاں مسخّر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت نصیر
"

انھوں نے یہ بیان "گنجِ شائگاں مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء ص ۱۰۸" کے حوالے سے درج کیا ہے۔ میرے پیشِ نظر یہ کتاب نہیں ہے لیکن اس کے ماننے میں کوئی بات بھی مانع نہیں۔ تاہم سیّد صاحب کے بیان کا باقی حصّہ یقیناً محلِ نظر ہے۔ لکھتے ہیں۔

(ص ۱۰۷) "۔۔۔۔۔۔۔۔ ان اشعار کے پس منظر میں جو انداز جھلک رہا ہے وہ اس بات کی غمّازی کرتا ہے کہ ان کا خالق بھی مرزا غالبؔ کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

خدا جانے سیّد صاحب نے ان اشعار کے انداز کی کونسی جھلک دیکھی جس نے اُنھیں ان اشعار کو غالبؔ کی تخلیق کہنے پر مجبور کر دیا۔ سکّوں کے اشعار (خاص کر مغل بادشاہوں کے سکوں کے فارسی اشعار) تقریباً ایک ہی انداز کے ہوتے ہیں۔ ان سے "سکّہ گو" کے خاص اسلوب کی نشاندہی ناممکن ہے۔ ان تین اردو شعروں کا انداز بھی بالکل وہی فارسی کا انداز ہے۔

(۹۷)

تذکرہ آثار الشعرائے ہنود از دیبی پرشاد بشاش

پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی کے ترجمے میں درج ہے۔

(ص ۱۳۲) "کوئی تو کہتا ہے کہ میر حسن کی مثنوی بدرِ منیر بہتر ہے اور کوئی کہتا ہے کہ گلزارِ نسیم کو اس پر ترجیح ہے ..... مگر مرزا غالب نے جو رائے اس بارہ میں دی ہے وہ بہت اچھی ہے۔ انصاف یہ ہے کہ خوب انصاف کی کہی ہے۔ یعنی کسی نے غالب سے پوچھا تھا کہ دونوں میں کون بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کہ "مثنوی میر حسن فصاحت است و گلزارِ نسیم بلاغت"۔"

صاحبِ تذکرہ نے یہ نہیں بتایا کہ غالب کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے۔ غالب کو داستانی ادب پڑھنے کا شوق تھا اس لیے اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے ان دونوں مثنویوں کا بصد شوق مطالعہ کیا ہوگا۔

(۹۸)

تذکرہ گلستانِ سخن از مرزا قادر بخش صابر دہلوی

اس میں فائز کے ترجمے میں ایک شعر یوں ہے ؎

"حضرتِ فائز نہ سمجھے ہم بہت کہتے رہے
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا"

اسی زمین میں غالب کی بھی گیارہ شعر کی ایک غزل ہے۔ مقطع ہے ؎

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

گویا دونوں مقطعوں کا مصرعۂ ثانی ایک ہی ہے۔ تذکرہ گلستانِ سخن ۱۸۵۷ء سے دو ایک ہی سال پہلے تالیف کیا گیا تھا اور اس میں فائز کی عمر کے لیے لکھا ہے کہ "چوبیس سے متجاوز نہیں" جبکہ غالب کے ہاں یہ شعر ۱۸۱۶ء تک کہا جا چکا تھا۔ میری رائے میں یہ سرقہ یا توارد نہیں ہے بلکہ کوئی مشاعرہ منعقد ہوا ہوگا جس میں طرح مصرع " دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا" مقرر ہوا ہوگا۔

فائز کا دوسرا شعر جو تذکرے میں درج ہے قابلِ ذکر ہے۔ چوبیس سال کی عمر میں ایسا شعر کہنا کارے دارد۔ شعر ہے ؎

کیا خطر ہے تابشِ خورشیدِ محشر سے مجھے
آہ سوزاں کا دھواں اک سائباں ہو جائیگا

تاہم مقطع کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فائز کی گرہ غالب کے مصرعۂ اوّل سے بہتر ہے۔

(۹۹)

عرفانِ شطّاری مرتّبہ صوفی نور محمّد شفق شطّاری ناشر صوفی عبد الکریم رونق شطّاری۔ پونہ (صوبہ بمبئی)

یہ کتاب "حضرت غفور شاہ قادری شطّاری علیہ الرحمۃ کے حالات" میں ہے اس کے ص ۱۹ پر درج ہے۔

"حضرت غفور شاہ علیہ الرحمۃ [صغیر اور صوفی سرمست] طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جب جناب استاد خداداد خاں مرحوم دہلی سے پونہ تشریف لائے تو آپ باقاعدہ ان سے اصلاح لینے لگے۔ جناب خداداد خاں مرحوم غالب دہلوی کے شاگرد تھے

میں سے تھے ۔ طبیعت بہت ہی موزوں تھی ایک روز کا
ذکر ہے کہ حضرت اور استاد خداداد خان صاحب مرحوم
کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے ۔
طرحی مشاعرہ تھا اور استاد نے کچھ لکھا نہیں تھا ۔
جب اپنے مکان سے روانہ ہوئے تو راستے میں شعر
لکھتے چلے جاتے تھے ۔ جب مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو سوا سو
شعر قلمبند فرما چکے تھے ۔ اس واقعہ سے ان کی (خداداد
خاں شاگردِ غالبؔ) طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

مرزا حمید بیگ تحمل قادری پونوی نے نومبر ۱۹۹۳ء میں تاریخِ اردو ادب ۔ پونہ (ایک تحقیق)" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے ۔ اس کے ص ۸۳ پر درج ہے کہ

" استاد خداداد خاں شاگردِ حضرت غالبؔ دہلوی ۔۔۔
دہلی سے ۱۸۵۷ء کے بعد پونہ تشریف لائے ۔ اور یہیں
مقیم ہوئے ۔ آپ کا پیشہ حکمت تھا ۔ آپ مشہور حکیم
حاذق تھے ۔ آپ کا انتقال بھی پونہ ہی میں ہوا ۔ لیکن
بسیار تحقیق کے بعد بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ پونہ
میں کہاں مدفون ہوئے "

نمونۂ کلام میں خداداد کی دو غزل نما نعتیں ہیں ۔ پہلی نعت کے چھ شعر ہیں اور دوسری کے سات ۔ دونوں مقطعوں میں تخلّص خداداد ہی درج ہے ۔ جیسے ؎

نہ کس طرح سے خداداد ہو مسخّر خلق
ہماری اتنی بھی تاثیر کیا سخن سے گئی

مانتے ہیں اہلِ ہند خداداد کا سخن
پہچانتے نہیں ابھی اہلِ دکن مجھے

اب مطلع بھی ملاحظہ فرمالیجیے

نبی کی شکل جو رنگین ادا پھبن سے گئی
اڑاتی خاک کو بادِ صبا چمن سے گئی

مدِ نظر ہے وہ رُخِ شاہِ زمن مجھے
بھاتا ہے باغباں نہیں تیرا چمن مجھے

اس طرح مرزا غالب کے شاگردوں میں ایک اور شاگرد حکیم خداداد خاں خداداد دہلوی ثم پونوی مرحوم کا اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے خداداد مرحوم کا ذکر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

(۱۰۰)

دیوانِ ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور (سن ندارد)

(ص ۱۳۷) "حکیم[۱] کلام کی محبت سے استاد [ذوق][۲] سے محبت رکھتے تھے۔ مگر خلیفہ [اسماعیل پسر ذوق][۳] کے سبب سے کھٹکتے تھے۔ خیال تھا کہ حضور پھر انھیں خدمت

---

[۱] احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک ثابت جنگ حکیم حاذق الزماں احسن اللہ خاں بہادر وفات ستمبر ۱۸۷۳ء

[۲] خاقانیِ ہند سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی۔ ولادت ۱۲۰۳ھ وفات دلی ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ (۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء)

[۳] وقار الدولہ محمد اسماعیل فوق پسر ذوق، ولادت قیاساً ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹-۱۰ء) وفات ۱۸۵۷ء

> سپرد نہ کردیں۔ ان [اسماعیل] پسر ذوق کے سامنے حکیم
> صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے۔ اسی لیے
> مرزا نوشہ (غالب مرحوم) کو (بادشاہ کے) حضور
> میں پہنچایا تھا۔ ---------"

یہ صحیح ہے کہ ذوق کے بیٹے محمد اسماعیل فوق کی شاہی دربار میں عزت تھی۔ ۲۱ر
دسمبر ۱۸۴۴ء کے سراج الاخبار میں انھیں وقار الدولہ شیخ محمد اسماعیل خاں بہادر
خلف سلطان الشعراء محمد ابراہیم خاں بہادر متخلص بہ ذوق" لکھا ہے۔ اس سے
پہلے یکم جولائی ۱۸۴۴ء کو ہی اخبار خبر دیتا ہے کہ محمد اسماعیل فوق کو "حسب الحکم
اقدس تنخواہ باغبانانِ علاقہ ہر بھرو کہ -------- حوالہ نمود"۔ ۵ر جون ۱۸۴۶ء
کے احسن الاخبار میں ہے کہ "بادشاہ سلامت نے خلیفہ محمد اسماعیل کو خلعتِ
شش پارچہ و سہ رقم جواہر عنایت کی"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرزند ذوق
ہونے کی وجہ سے شاہ ظفر، اسماعیل فوق کا وافر لحاظ کرتے ہونگے۔ شاید کوئی
دن ایسا بھی آگیا ہو گا کہ خلیفہ اسماعیل، حکیم احسن اللہ خاں پر بھی سبقت لے گئے
ہوں، مگر اس کا کوئی ثبوت سوائے آزاد کے بیان کے ہمارے پیش نظر نہیں
اسی طرح اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسمٰعیل پر ذوق کا عمل دخل کم
کرنے کے لیے ہی حکیم صاحب نے غالب کو قلعے کی ملازمت دلوائی تھی۔
تاہم یہ بات نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ غالب جب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو
بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے ہیں تو

(۱) بادشاہ نے انھیں "نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ" کہہ کر
خطاب کیا اور چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت پہنایا۔
اور ان کا پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا، جبکہ خلیفہ محمد اسماعیل
فوق کو وقار الدولہ کا خطاب چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت
پہلے ہی عطا ہو چکا تھا اور شاہی ملازم تو وہ ایک مدت سے تھے۔

(۲) غالب کو بادشاہ کے حضور میں پہنچانے میں دو برگزیدہ ہستیوں

نے مدد کی تھی، ان میں ایک بلا شبہ حکیم احسن اللہ خاں
مدار المہام شاہ ظفر تھے اور دوسرے تھے مولانا نصیر الدین
عرف میاں کالے جو بادشاہ کے پیر تھے۔

ممکن ہے ذوقؔ اور غالبؔ کے درمیان تناؤ قائم رکھنے والوں نے یہ بات بنا لی ہو جو ۴ جولائی ۱۸۵۰ء سے ذوقؔ کی وفات ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء تک گرم رہی ہو مگر اس میں کوئی سچائی نہیں معلوم ہوتی۔ میاں کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں ہی غالبؔ کے نہ صرف قدر داں تھے بلکہ دوست بھی تھے ایسی دوستی حاسدوں سے کب برداشت ہوتی ہے۔

(۱۰۱)

مرآۃ الغالب از بیخودؔ دہلوی، عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ، بار چہارم ۱۹۵۵ء

[اس شرحِ دیوانِ غالبؔ کا دیباچہ "طاہر نبیرۂ حضرت آزادؔ نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء کو لکھا تھا۔ اس لیے قیاس ہے کہ یہ کتاب پہلے پہل ۱۹۳۴ء ہی میں شائع ہوئی ہوگی]

(ص ۲۰۹) "بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا - رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا
...... (غالبؔ) فرماتے ہیں، بزمِ سخن شاہنشاہ میں
مشاعروں کا دور دورہ پھر شروع ہوگیا، وہ زمانہ، وہ موسم آگیا
جس میں ہفتہ وار مشاعرے جاری ہوگئے۔ گویا دفترِ سخن کھل
گیا ......"

غالبؔ کی یہ غزل دیوانِ غالبؔ (قلمی) نسخۂ لاہور مکتوبہ بعد اگست ۱۸۵۲ء میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۵۲ء یا اس کے کچھ پہلے ہی کہی گئی تھی مگر ایسا کوئی ثبوت تاحال دستیاب نہیں کہ یہ شاہی مشاعرے کے لیے ہی کہی گئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی طرحی غزل کے ساتھ یہ غزل بھی پڑھ دی گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے (بلکہ اس کا زیادہ امکان ہے)

کہ غزل جواں بخت کے سہرے (فروری۔ مارچ ۱۸۵۲ء) کے موقع پر کسی خصوصی شعری نشست میں پڑھی گئی ہو۔

اس شعر کا مقطع ہے۔

اس کی اُمّت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ، گنبدِ بے در کھُلا

اس میں جو شہ (شاہ) کا لفظ آیا ہے وہ شاہ ظفرؔ کے لیے نہیں بلکہ رسولِ مقبولؐ کی شان میں ہے اور "گنبدِ بے در" کا کھُلنا حضرتؐ کے شبِ معراج میں آسمان پر تشریف لے جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(ص ۵۵) "کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا
سُنا گیا ہے کہ یہ مشاعرہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے طرح میں غزل نہ لکھی تھی۔ جب اصرار مبالغہ کی حد تک پہنچ گیا تو غیر طرح غزل پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا ـــــــــ"

یہ غزل پہلے پہل نسخۂ رام پور ثانی مکتوبہ ۱۸۵۵ء میں درج ہوئی تھی مگر اس کا ایک شعر گلستانِ سخن میں بھی ملتا ہے یہ کتاب اپریل ۱۸۵۴ء سے قبل کی تالیف ہے۔ لہٰذا اس غزل کو اپریل ۱۸۵۴ء یا اس سے کچھ پہلے کی فکر کردہ کہنا چاہیے۔ یہ ثبوت کہیں سے فراہم نہیں ہوتا کہ یہ کسی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی۔

(ص ۱۰۲) "کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

- - - - "لیوے" کا لفظ بہت قدیمی زبان کا ہے۔
مرزا صاحب کو یہ اردو دیوان لکھے ہوئے تقریباً ایک سو یا مدہ برس گزر رہے۔ اب یہ اور اس کے ساتھ اور بہت سے الفاظ متروک ہو گئے۔ آخر عمر میں مرزا صاحب نے بھی ایسے صدہا لفظ ترک کر دیے تھے۔"

"ایک سو بارہ برس گزرے" کے معنی (۱۹۳۴ء - ۱۱۲ =) ۱۸۲۲ء کا سال ہوا مگر یہ غزل ۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۹ء کے درمیان کہی گئی تھی۔ اس لیے ۱۸۴۷ء سے پہلے کے غالب کے کسی دیوان (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شامل نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں اس غزل کو کہے ہوئے زیادہ سے زیادہ ۸۷ سال ہوتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں کہ غالب نے آخر عمر میں ایسے (دیکھوے کی طرح کے) صدہا لفظ ترک کر دیے تھے۔ انھوں نے اس کی ضرورت ضرور محسوس کی ہوگی مگر پھر بھی انھوں نے دیوان کی آخری اشاعت ۱۸۶۳ء تک کئی ایسے الفاظ کو اپنے دیوان میں قائم رکھا جو اس وقت تک متروک ہو چکے تھے۔

(ص ۱۳۶) " وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہیں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

شیفتہ سے مراد نواب مصطفیٰ خاں بہادر۔۔۔۔۔
اور وحشت سے مراد غالباً غلام علی خاں۔۔۔۔۔ ہیں اور
یہ دونوں مرزا صاحب کے شاگرد نہ تھے مگر شاگردوں
سے زیادہ میرزا صاحب کے ماننے والے تھے۔ موتمن
خاں صاحب کے انتقال کے بعد یہ دونوں صاحب
مشورۂ سخن میرزا غالب ہی سے کرتے تھے — "

شیفتہ کا مومن اور غالب کا شاگرد ہونا مسلّم ہے مگر وحشت کا غالب سے اصلاح لینا ثابت نہیں ہے۔

وحشت کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ خمخانۂ جاوید جلد ششم مرتبہ خورشید احمد خاں یوسفی ص ۳۱۶ پر لکھا ہے (نیز اسی کتاب کا ص ۵۳۵ بھی ملاحظہ کیجیے)۔

"شاعر نامور غلام علی خاں مراد آبادی مولد شاہجہاں آباد۔ ۱۸۴۷ء میں چالیس برس کی عمر تھی اور مہاراجہ الور کی سرکار

میں ملازم تھے۔ مومن خاں سے مستفید تھے ذکی الطبع
و سخن فہم باکمال تھے۔ حضرتِ غالبؔ، مومن خاں، شیفتہ
و آزردہ مرحوم کے ہم صحبت و دلی دوست تھے"۔

چند تذکروں مثل شمیم سخن اور سخن شعراء میں وحشت کے والد کا نام میر فرحت اللہ خاں اور خسر کا نام مولوی محمد رشید الدین خاں دہلوی لکھا ہے۔ مزید درج ہے کہ وحشتؔ نے بنارس اور دہلی میں نشو و نما پائی۔ بلند شہر میں سکونت تھی۔

(ص ۱۴۰) " قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

۔۔۔۔ ۔۔ ۱۲۵۷ (۱۸۵۷ء) سے پہلے مرزا صاحب پر کسی دکان دار نے قیمت شراب کی بابت نالش دائر کر دی تھی۔ مقدمہ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صاحب صدر الصدور کی عدالت میں پیش ہوا۔ جواب دعویٰ میں میرزا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پڑھ دیا۔۔۔۔۔۔۔۔"

مفتی صدر الدین آزردہ ۱۵ جون ۱۸۴۴ء کو صدر الصدور مقرر ہوئے تھے لیکن یہ شعر نسخہ بھوپال (حمیدیہ) مکتوبہ ۱۸۲۱ء کے متن میں موجود ہے۔ جواب دعویٰ میں اس کے "فی البدیہہ" کہہ کر پڑھے جانے کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ یہ پانچ شعر کی باقاعدہ کہی ہوئی غزل ہے اور یہ شعر تیسرا ہے اس لیے اسے بعد کا اضافہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ محض شعر کو سامنے رکھ کر یہ قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔

"کسی دکان دار" کے نالش کرنے کا واقعہ یہ مشہور انگریز شراب فروش میکفرسن نے کی تھی۔ جام جہاں کے کلکتہ کے ۷ جون ۱۸۳۷ء میں خبر چھپی تھی کہ غالبؔ، یوسف خاں (بھائی) کی ملاقات کو جا رہے تھے کہ اثنائے راہ میں عدالت کے چپراسی نے دو سو پچاس روپے کی نالش کی بابت جو میکفرسن نے کی تھی انھیں گرفتار کر کے ناظر کے مکان میں قید کر دیا۔ چنانچہ (نواب) امین الدین خاں نے چار سو روپیہ اصل مع سود ادا کر کے رہا کرایا۔"

مگر یہ واقعہ بھی مئی ۱۸۲۷ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بھی آزردہ ابھی صدر الصدور مقرر نہیں ہوئے تھے اور شعر توفی البدیہہ کہا ہی نہیں گیا تھا بلکہ بہت پہلے یعنی ۱۸۲۱ء سے یا اس سے کچھ پہلے کہا گیا تھا۔

(ص ۲۸۵) "دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

میرزا یوسف میرزا صاحب کے بڑے بھائی تھے جو عنفوانِ شباب میں دیوانے ہو گئے تھے۔۔۔۔۔۔"

میرزا یوسف، غالبؔ کے بڑے نہیں چھوٹے بھائی تھے۔ وہ غالبؔ سے دو سال چھوٹے تھے۔ یہ شعر غالبؔ نے اپنے کلکتہ کے قیام کے دوران میں اپریل ۱۸۲۸ء میں، اپنے دیوانے بھائی کی صحت یابی کی خبر سُن کر اپنی غزل میں اضافہ کیا تھا۔

(۱۰۲)

مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سیّد سلیمان ندوی مطبوعہ (۱۹۹۲ء) دار المصنّفین۔ اعظم گڑھ

مولانا محمد علی (متوفی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء) اپنے مکتوب مورخہ ۸ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ (ستمبر ۱۹۱۹ء) میں لکھتے ہیں

(ص ۸۲/۸۳) "غالبؔ اواخرِ عمر میں گلی قاسم جان میں کرایہ کے مکان میں آکر رہے، آنکھوں سے سوجھتا کم تھا، کانوں سے بالکل سنائی نہ دیتا تھا، مغرب کے وقت پالکی نئے گھر جا کر اتری، جیسے ہی اتر کر بیٹھے تھے کہ نمازِ مغرب کے لیے اذان ہوئی، مسجد کے عقب میں یہ مکان واقع تھا، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ پر حاضرین نے انگوٹھے چومے اور آنکھوں سے لگائے، تو پوچھا کیا ہے، کسی نے لکھ کر

پڑھ دیا کہ اذان پاس کی مسجد میں ہو رہی ہے، اسی وقت یہ شعر کہا ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

نسخۂ عرشی میں (جہاں سے لے کر میں نے دیوان غالبؔ کامل نسخۂ رضا میں یہ حوالہ درج کیا۔) اس شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ

"یہ شعر مرزا صاحب نے اپنے مکان واقع محلۂ بلی ماران کے متعلق کہا تھا۔ مولانا حالیؔ کے بیان کے مطابق یہ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا اور اسی میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

...... مولانا مہرؔ کی رائے ہے کہ اس میں میرزا صاحب جنوری ۱۸۶۶ء کے بعد منتقل ہوئے تھے ......"

مگر کسی نے مولانا محمد علی مرحوم کی بیان کردہ وجہ فکرِ شعر کہیں درج نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے مولانا نے غالبؔ کے نئے مکان اور مسجد کے محلِ وقوع کو سامنے رکھ کر ایک کہانی گھڑ لی جس کا مقصد تفننِ طبع کے سوا کچھ نہ تھا۔

(۱۰۳)

دیوانِ دردؔ۔ مکتبہ جامعہ دہلی مطبوعہ ۱۹۷۱ء

خواجہ میر دردؔ (۳۱ر اگست ۱۷۲۱ء تا ۶ر جنوری ۱۷۸۵ء) اردو شاعری میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انھیں عموماً صوفی شاعر مان لیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ نرے کھُرے شاعر تھے، میٹھی میٹھی ہلکی ہلکی ٹیس والے بہت اچھے شاعر۔ مگر کبھی کبھی شوخ اور رچیدار شعر بھی کہہ جاتے تھے۔ جیسے ؎

(ص ۹۰) مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جس کے ہاتھ آوے جام سو جم ہے

غالبؔ نے شاید اسی شعر کو ترقی دے کر یہ شعر کہا ہوگا ؎

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

دونوں اشعار کے مفاہیم میں زیادہ فرق نہیں اور الفاظ میں بھی نمایاں مشابہت ہے۔

(۱۰۴)

شذراتِ سلیمانی حصہ اوّل مطبوعہ ۱۹۹۰ء، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظمگڈھ

مولانا سیّد سلیمان ندوی (۲۲ر دسمبر ۱۸۸۴ء تا ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء) بلند مرتبہ عالم اور بڑے ادیب تو تھے ہی، ایک اچھّے شاعر بھی تھے۔ انھیں علم و ادب سے گہرا شغف تھا۔ درجِ بالا کتاب ان شذرات پر مشتمل ہے جو انھوں نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں جولائی ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۲۴ء تک لکھّے۔ ان کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ انھوں نے غالبؔ کے اردو فارسی کلام کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ شذرات میں وہ غالبؔ کے اشعار بے ساختہ چسپاں کرتے جاتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے۔

(ص ۱۷) "معارف نے ۱۹۱۶ء کے اختتام پر اپنی عمر کی پہلی ششماہی پوری کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (جنگ کی وجہ سے) قانون کی منت گیری ایک طرف اور سامانِ طبع کی کمیابی نے دوسری طرف ہندوستانی پریس کے پرانے اور کہنہ سال دفتروں کو

ماتم کدہ بنا دیا ہے۔ پھر اطفالِ نوخیز کی داستانِ غم کیا سنائی جائے، جن کی زبانِ حال پر یہ مصرع ہے ؎

اُڑنے نہ پلئے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے[1]

............لیکن آخر معارف کے قدر دانوں پر بھی تو کچھ فرائض عائد ہیں۔ یہ فقرہ اس لیے زبان پر آگیا کہ

کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے[2]

(ص ۲۳) " دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ زندگی نے ۲۴ سال کی عمر میں اس عالم کو الوداع کہا..........

....

مَیں مرحومہ کی زندگی میں غالبؔ مغفور کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

مَیں بھی تمہیں بتاؤں کہ مجنوں نے کیا کیا[3]

فرصت کشا کشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

اس پیکرِ وفا نے جان [دی]......لیکن ایسا کانٹا دل میں چبھ کر رہ گیا، جو شاید عمر بھر نہ نکلے ؎

عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے[4]

---

[1] پورا شعر یوں ہے ؎ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

[2] " " " ؎ مَیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مُدّعا کیا ہے

[3] یہ مصرع اصلاً یوں ہے ؎ تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا

[4] اصل نظم / غزل کے بتدریج جو تھا، گیارھواں اور دوسرا شعر

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
گوش محروم[1] پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے "

(ص ۶۲) " ہمارے دوست مولانا عبد السلام ندوی شعر الہند کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے۔ وہاں کے کتب خانۂ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر یعنی مرزا غالب کا اصلی مکمل اردو دیوان بلا حذف و انتخاب، جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے۔ نہایت عمدہ مطلّا نسخہ ہے، کسی خوش مذاق کے ہاتھ وہ پڑا تھا۔ اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلافِ نسخ بھی لکھ دیا ہے۔

یہ نسخہ اب جناب ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مشیر تعلیمات بھوپال کے مطالعے میں ہے۔ موصوف آج کل دیوانِ غالب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور عنقریب ان کے نتائج فکر ترقیِ اردو کے ذریعے سے منظرِ عام پر آئیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کیا ہے کہ اس نئے نسخے پر تقریظ لکھ کر وہ ناظرینِ معارف کے لیے مرحمت فرمائیں۔ "

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی یہ عبارت معارف کے ستمبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن (جون ۱۸۸۵ء) نے تقریظ (دیباچہ[2]؟) تو لکھ لی تھی مگر

---

[1] اصل مہجور
[2] محاسنِ کلامِ غالب

ان کی ناگہانی موت (۷ نومبر ۱۹۱۸ء) نے سارا کام ہی بگاڑ دیا۔

(ص ۹۱) ـ ـ ـ ـ ـ اگر ایک روز کل مخلوق کے لیے یوم احتساب کا آنا برحق ہے تو ـ ـ ـ ـ ـ اس وقت ـ ـ ـ ـ ہر مذہب و ملت کے مسند نشیناں امامت ـ ـ ـ ـ کے فردِ اعمال کا بھی ایک ایک جزئیہ آئینہ ہو گا اور مرحوم غالبؔ کی روح تو اس وقت بھی صدا دے رہی ہے ؎

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو "

(ص ۱۰۷) "ـ ـ ـ ـ دکن کے دائرۃ المعارف نے ایک زمانہ میں متعدد نادر و مفید عربی کتب کی طبع و اشاعت کا کام کیا تھا لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے، عربی زبان کا زندہ کرنے والا یہ ادارہ ایک مدت سے خود مردہ ہو گیا ہے ؎

دیکھا[۱] کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے "

(ص ۱۱۱) [مولانا نے لکھا ہے کہ ہم مشرقی ان مغربیوں کی اندھا دھند پیروی میں بری طرح برباد ہو گئے ہیں اور اب مغربیوں کی طعنہ زنی پر نادم ہیں۔ یہ شعر اسی مفہوم پر چسپاں کیا گیا ہے ــــ] ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ تو[۲] بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ـــــــ

[۱] پورا شعر یوں ہے ؎ ہاں اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

[۲] کہ "تو" کی جگہ اصلاً "کہ یہ" ہے

(ص ۱۲۱) " ؎ کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
سنتے ہیں کہ سیاسیات کی دنیا میں بھی کچھ اسی قسم کے قوانین
کار فرما ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

(ص ۱۵۶) " علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شاہزادہ ولی عہد بہادر کے ورود
کے موقع پر آنریری ڈگریوں کی جس فیاضانہ تقسیم کا اعلان
کیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس قدر حسرت و یاس کا مقام ہے کہ
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمنا بھی پوری نہ ہو سکی ۔ نہ شہزادہ صاحب نے
مسلم یونیورسٹی میں قدم رنجہ فرمایا نہ اکابرِ قوم کو حضوری کی
قابلِ رشک سعادت حاصل ہو سکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ
ہم اپنی دلی ہمدردی و تعزیت کا تحفہ بہ صد ادب پیش کرتے ہیں لیکن معلوم
ہوا کہ یونیورسٹی کے ارباب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غالبؔ کے فلسفہ ؎
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر[1]
کے پورے راز شناس تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹھیک اسی تاریخ
کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان حضرات نے علی گڑھ و لکھنؤ کے وسط
میں ایک مشہور اسلامی ریاست میں ایک دوسری بزم سرود
ترتیب دی اور علی گڑھ کا غم غلط کرنے کے لیے ایک شبانہ
روز مخموری و سرخوشی میں بسر فرمایا "

(ص ۲۰۷) " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کے چند سال قبل ہندوستان میں جرمنوں
کی متعدد مشنری سوسائٹیاں قائم تھیں ۔ آغازِ جنگ ہوتے

---

[1] پورا شعر ؎ نہ لڑ ناصح سے غالبؔ! کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہی ۔۔۔۔۔ حکومتِ برطانیہ نے ۔۔۔۔ ان کو فرزلِ فنا
تک پہنچا دیا ۔۔۔۔۔۔ جس قوم کا اپنوں کے ساتھ یہ برتاؤ
ہو، بیگانوں کو اس سے جس قسم کی توقعات رکھنی چاہیے
اس کا اظہار لاحاصل ہے ؎

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ[1] "

(ص ۲۲۵) "۔۔۔۔۔۔ ہم نے اپنی [علی گڑھ] یونیورسٹی کے [خطاب
دینے کے] اس طرزِ عمل کے متعلق دیوانِ غالب میں فال
دیکھی، تو یہ جواب ملا ؎

غالبِ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری
بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل "

(ص ۲۲۹) "اردو فارسی کے قدیم خدمت گزاروں میں ایک مولانا شوکت
میرٹھی تھے جو خود کو 'مجدّد السنۂ شرقیہ' کے خطاب سے
مخاطب کرتے تھے۔ انھوں نے خاقانی، عرفی اور غالب
کے دیوانوں کی عجیب و غریب شرحیں لکھی ہیں۔ اور ہمیشہ اپنے
مذاق کے مطابق وہ کچھ نہ کچھ کرتے اور کہتے رہتے تھے۔
افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ انھوں نے ایک طویل علالت
اور کبرسنی کے بعد وفات پائی۔ ایسے لوگ بھی ہمارے
ہندوستان میں آئندہ پیدا نہ ہونگے ــــــــ "

مولانا شوکت میرٹھی ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی وفات میرٹھ میں ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو جگر اور معدہ کے خراب ہو جانے سے ہوئی تھی۔ مولانا شوکت نے غالب کے کلام کی شرح ہی نہیں کی بلکہ کئی مقامات پر ان کے کلام کو اپنی اصلاح سے بھی نوازا ہے۔ تاہم ان کے علم و فضل میں کلام نہیں۔

---

[1] ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہے پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

(۱۰۵)

تذکرہ آثار الشعرائے ہنود از دیبی پرشاد بشاش۔ مطبوعہ مطبع دہلی ستمبر ۱۸۸۵ء۔ (سالِ تکمیل ۱۳۰۰ھ۔ ۱۸۸۳ء۔ ۱۸۸۲ء)

(ص ۱۳۲) "[ترجمۂ نسیم تخلص پنڈت دیا شنکر۔ مثنوی گلزارِ نسیم کے بارے میں درج ہے۔ "کوئی تو کہتا ہے کہ میر حسن کی مثنوی بدرِ منیر [سحر البیان] بہتر ہے اور کوئی کہتا ہے کہ گلزارِ نسیم کو اس پر ترجیح ہے اور بعض بعض اصحاب دونوں ہی کو لاجواب بتاتے ہیں مگر مرزا غالبؔ نے جو رائے اس بارہ میں دی ہے وہ بہت اچھی ہے۔ انصاف یہ ہے کہ خوب انصاف کی کہی ہے یعنی کسی نے غالبؔ سے پوچھا تھا کہ دونوں میں کون بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا 'مثنوی میر حسن فصاحت است و گلزارِ نسیم بلاغت'۔"

میری نظر سے غالبؔ سے منسوب یہ بیان کسی اور قدیم ماخذ میں نہیں گزرا۔ غالبؔ کے رائے دینے کا یہ انداز بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے کہہ کر غالبؔ سے منسوب کر دیا ہے۔ اور وہ ہی مؤلفِ تذکرہ نے ہم تک پہنچا دیا۔

(۱۰۶)

سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان۔ فکشن ہاؤس لاہور۔ ۱۹۹۳ء

یہ جناب سید انیس شاہ جیلانی کے اس سفر کی روداد ہے۔ جو اُنھوں نے

۱۹۸۲ء میں دہلی، آگرہ، اجمیر وغیرہ شہروں کی سیاحت کے لیے کیا تھا۔ ایک جگہ درج ہے

(ص ۲۰۵) "احمد سعید [راشن والے۔ دہلوی] غالبؔ شناس ہیں۔ اونچی کرسی کی ایک مسجد میں غالبؔ وضو کر رہے تھے۔ سڑک پر کھڑے ہوئے ایک شاگرد نے بغل میں دبی ہوئی بوتل دکھائی۔ وضو چھوڑ کر نکل آئے۔ شاگرد نے کہا نماز پڑھ لیجیے۔ بس، جس چیز کے لیے نماز پڑھ رہا تھا وہ مل گئی، یہ لطیفہ احمد سعید صاحب نے سنایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

غالباً یہ لطیفہ اُسی مشہور لطیفے کی ترقی یافتہ شکل ہے جو اکثر کتابوں میں دیکھا گیا ہے۔ لطائفِ غالبؔ مؤلفہ حکیم محمد حسن میرٹھی (مطبوعہ تقریباً ۱۹۰۴ء) ص ۴ پر اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

"ایک شخص نے ایک روز مرزا صاحب (غالبؔ) کے سامنے شراب کی نہایت مذمّت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا صاحب نے کہا بھائی! جن کو شراب میسّر ہے اس کو اور کیا چاہیے کہ جس کے لیے دُعا مانگے ــــــــ"

(۱۰۷)

خمخانۂ جاوید جلد سوم مطبوعہ ۱۹۱۷ء ص ۵۴۸

"روشن۔ منشی دیوان روشن لال صاحب متخلّص بہ حالبؔ و روشنؔ، ابن منشی دیوان مُنّا لال صاحب کالستھ دہلوی۔ حضرت غالبؔ مرحوم سے تلمذ کا دعویٰ

ہے مگر ظاہر اس کی کوئی اصلیت معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے بعض احباب انھیں مرزا دولھا اور بعض صرف استاد کہتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ باسٹھ ۶۲ ترسٹھ ۶۳ اس کی عمر ہے۔

۔۔۔۔۔۔ ۵ [کل شعر ۵ ہیں مگر صرف ۲ ہی درج کیے جاتے ہیں]

الٰہی کیا فسوں دل پر کیا ہے چشم میگوں نے
کہ ہم کعبہ سے پھر کر ہو گئے رہ گیر میخانہ

یہی گر دَور دَورہ میکشی کا ہے زمانے میں
تو کعبہ سے کہیں بڑھ جائے گی توقیرِ میخانہ

اگرچہ خمخانۂ جاوید کی جلد ۱۹۱۷ء میں چھپی تھی تاہم یہ ۱۹۱۴ء تک مکمل ہو چکی تھی۔ اگر روشن کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں داخلِ کتاب کیا گیا ہو تو سالِ ولادت ۱۸۵۰ء قرار پاتا ہے۔ اس طرح غالب کے انتقال کے وقت روشن کی عمر ۱۹ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ چونکہ سکونت بھی دہلی ہی کی تھی، اس لیے ممکن ہے دو ایک غزلوں پر غالب سے کبھی اصلاح لی ہو اگرچہ غالب کے باقاعدہ شاگرد نہ ہوں۔

(۱۰۶)

غالب نامہ۔ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب نمبر۔ نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۹۳ء

"سیّد مسعود حسن رضوی کی ادبی زندگی" کے عنوان کے تحت (ص ۲۵) پروفیسر نیّر مسعود لکھتے ہیں:

(ص ۲۷) "۔۔۔۔۔ ادیب [سیّد مسعود حسن رضوی] کے والد حکیم سیّد مرتضیٰ حسین کا بھی علمی اور ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ ان کا نقل کیا ہوا ایک نوحہ (اے لاشۂ بے سر ترا سر لائی ہے زینب!)

میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کے مصنف محمد رضا حکیم
شاگردِ غالب تھے۔ حکیم کے حالات نہیں معلوم، بلکہ
تلامذۂ غالب کی فہرست میں ان کا کوئی اور حوالہ بھی میری
نظر سے نہیں گزرا۔ اس لحاظ سے حکیم مرتضیٰ حسین غالب
کے ایک شاگرد کا واحد حوالہ قرار پاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔"

گویا محمد رضا حکیم بھی غالب کے شاگرد نکلے۔ اس طرح غالب کے شاگردوں
میں ایک اور شاگرد کا اضافہ ہوا۔

(۱۰۹)

نیا دور لکھنؤ، جون ۱۹۹۵ء - امیر خسرو اور فارسی غزل از وارث کرمانی ص ۱۷

(نظیری کا شعر) " ببر زند بجائے پر و بالش، بسر و منقار :: مرغے کہ بلند آز بر ایں شاخ، تو اکرد
(اگر کسی چڑیا نے اس شاخ سے آواز بلند کی تو اس
کے پر و بال کاٹنے کے بجائے چونچ اور سر کاٹ
دیا جاتا ہے۔)
مرزا غالب اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اس نکتہ کی وضاحت
کرتے ہیں ؎

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است — بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

(وہ راز جو میرے سینے میں پوشیدہ ہے وعظ نہیں
ہے جسے منبر پر مولوی لوگ بیان کرتے ہیں اس راز
کو صرف پھانسی کے تختے پر ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔"
غالب کا یہ شعر یقیناً نظیری کے شعر پر اضافہ ہے۔

غالب کے اس "شعر کو خسرو کے شعر کی آوازِ بازگشت" بتایا گیا ہے

جو قطعی درست ہے۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر (غالب)

خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق ما را کار نیست (خسرو)
(دنیا کہتی ہے کہ خسرو بُت پرستی کرتا ہے۔ ہاں ہاں
کرتا ہوں مجھے دُنیا سے سروکار نہیں ہے۔)

(۱۱۰)

رسالہ رہنمائے تعلیم بابت ماہ اپریل ۱۹۹۵ء۔ مضمون "اردو اور آگرہ" از منشی ٹنڈن (ص ۱۴)

"کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ مرزا غالب نے اُن (نظیر اکبر آبادی)
سے استفادہ کیا تھا۔ میاں نظیر فرماتے ہیں ؎

تھے کل یہ خطِ عارضِ خوبانِ سبز رنگ
کہتے ہیں آج خلق جنھیں سبزہ زار رہا

مرزا غالب نے تقریباً یہی مضمون نہایت فصاحت و بلاغت
کے ساتھ نظم کیا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں"

یہ صحیح ہے کہ یہ مضمون نیا نہیں مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ غالب
نے یہ خیال نظیر اکبر آبادی سے لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ
یہ خیال اُردو شاعری کا اپنا ہے ہی نہیں۔ کسی اور زبان

یں ہو کہ نہ ہو فارسی شاعری میں صدیوں سے مروّج ہے۔ پہلے عمر خیّام کی ایک رُباعی دیکھ لیجیے ؎

در ہر دشتے کہ لالہ زارے بوداست
آں لالہ زخونِ شہریارے بوداست
ہر برگِ بنفشہ کز زمیں می روید
خالے ست کہ بر روے نگارے بوداست

خسروؔ نے اسے یوں ترقّی دی ؎

اے گُل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آں روے ہا کہ در تہہ گردِ فنا شدند

بیدلؔ نے اسے اپنے انداز میں اپنایا ؎

خلقے بہ عدم دود عدم داغِ جگر بُرد
خاکے ہمہ صرفِ گُل و سنبل شدہ باشد

بیدلؔ کا عہد ۱۶۴۴ء تا ۱۷۲۰ء ہے۔ سوداؔ، بیدلؔ کے انتقال کے وقت محض ۱۳ سال کے تھے (۱۷۰۶ء تا ۱۷۸۱ء) انھوں نے خیامؔ، خسروؔ اور بیدلؔ سے شہ پاکر اس خیال کو کچھ اُلٹ پھیر کے بعد پہلی بار اُردو میں داخل کیا ؎

گئے دُجہان سے کیا کیا ستیزہ رو تہہِ خاک
کہ گل عدم سے جو آیا بہت فگار آیا

میرؔ تقی میرؔ، سوداؔ سے ۱۷ سال چھوٹے تھے۔ (۱۷۲۳ء تا ۱۸۱۰ء)۔ انھوں نے تو جھڑی ہی لگادی ؎

ہیں مستحیلِ خاک سے اجزا ئے نوخطاں
کیا سہل ہے زمیں سے کھلنا نبات کا
ہر قطعۂ چمن پہ ٹک گاڑ کر نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

کو گُل و لالہ، کہاں سُنبل سمن ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

ناسخ (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۸ء) بھی پیچھے نہیں رہے ؎

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گُل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

باغ میں گلبن ہیں، گلدستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گُل رخسار پنہاں ہو گئے

اب جا کر نظیر اکبر آبادی کی باری آتی ہے اور اس کے بعد غالب کی مگر یہ روایت غالب کے بعد بھی اسی شد و مد سے جاری رہی۔ چنانچہ جناب ناطق گلاؤٹھوی مرحوم تلمیذ داغ کا ایک شعر بھی سُننے کے قابل ہے ؎

فلک! یہ چند گُل بوٹے جو نکلے بھی تو کیا نکلے
گئی جو خاک میں وہ اچھی صورت پھر نہیں نکلی

تفننِ طبع کے لیے راقم الحروف بھی اپنی پُرانی غزل سے ایک شعر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے ؎

وہی جمال، وہی رنگ، تمکنت بھی وہی
یہ پھول نکلے زمیں سے کہ نازنیں نکلے

غالب تو اپنا مقام بنا ہی چکے ہیں۔ جعفر زٹلی کے بعد اگر اردو زبان کا کوئی شاعر عوام کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور ایسی کامیابی کے ساتھ کہ اس کے کئی اشعار خود لوگوں کی زبان بن گئے ہیں تو وہ نظیر اکبر آبادی ہے۔

(۱۱۱)

"معارف" اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۲۷۷

ڈاکٹر شمیم اختر (بنارس سے) اپنے مضمون "بنارس کا ایک فارسی گو شاعر۔ مُلّا سابق" میں لکھتے ہیں:

"بنارس کی ایک مسجد میں دو قبریں ہیں جو عاشق و معشوق کی قبریں کہلاتی ہیں اور نہ صرف مسجد بلکہ پورے محلہ کا نام قبر عاشق و معشوق ہے اور یہ اندراج سرکاری کاغذات میں بھی ہے۔ مرزا غالب جب سفرِ کلکتہ کے دوران بنارس میں ٹھہرے تو ان کی قبروں کی زیارت کے لیے بھی گئے تھے۔ مشہور ہے کہ عاشقِ نامراد کے جذبۂ صادق کی آزمائش دریائے گنگ میں اس وقت ہوئی جب معشوقہ کی جوتی اسکی خادمہ نے دریا میں ڈال کر کہا اگر عشق صادق ہے تو دریا میں ڈوب کر جوتی نکال لائیے۔ عاشق دریا میں کود گیا۔ عاشق کا ڈوبنا دیکھ کر معشوقہ بھی کود پڑی اور دونوں لاشیں بغل گیر حالت میں ندی سے نکالی گئیں ——"

غالبؔ سفرِ کلکتہ کے دوران میں لگ بھگ ایک ماہ (یکم دسمبر ۱۸۲۷ء تا ۲۹ دسمبر ۱۸۲۷ء) بنارس میں رہے۔ یہ شہر اُنھیں بہت پسند آیا۔ یہیں اُنھوں نے "مثنوی چراغِ دَیر" کہی۔ اس مثنوی کے مفاہیم غماز ہیں کہ غالبؔ نے اِن ایام میں بنارس کے پنڈتوں اور دانشوروں سے ہندو فلسفے کے نکات سے آگاہی حاصل کی تھی۔ خود مثنوی کے ۱۰۸ اشعار اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ ہندوؤں کے نزدیک ۱۰۸ کے عدد کی تقدیس کا غالبؔ کو علم تھا۔ اسی طرح یقینی ہے کہ غالبؔ

نے حزیں کی قبر کی بھی زیارت کی ہو گی اور انھی دنوں یعنی دسمبر ۱۸۲۷ء ہی میں "عاشق و معشوق کی قبروں" کی سیر بھی کی ہو گی۔

بہت سی باتوں کی طرح ہمیں نہیں معلوم کہ غالب کے بنارس میں مہینہ بھر کے قیام کی تفصیل کیا ہے تاہم اگر ذرا سی روشنی ملی ہے تو یہ بھی غنیمت ہے۔

غالب سے متعلق یہ اطلاع ڈاکٹر شمیم اختر کو شاید "ملا ساقی (حزیں کے ایک ہم عصر) کے پوتے مولوی عبدالقادر مرحوم کے ایک رسالہ سے ملی ہو گی جو ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔

غالبیات
از: کالی داس گپتا رضاؔ
متعلقات غالب (مضامین) ۳۰ روپے
دعائے صباح (غالب کی ایک منظوم فارسی مثنوی) ۳۰ روپے
غالبیات۔ چند عنوانات (مضامین) ۵۰ روپے
انتخاب آتش و غالب از چکبست ۳۰ روپے
دیوانِ غالب (عکسی ۱۸۴۱ء) ۲۰۰ روپے
دیوانِ غالب (عکسی ۱۸۶۲ء) ۱۴۰ روپے
آبِ حیات میں ترجمۂ غالب ۲۰ روپے
غالبیات۔ چند شخصی اور غیر شخصی حوالے ۵۰ روپے
غالب درونِ خانہ ۱۲۵ روپے
غالب کی بعض تصانیف ۸۰ روپے
دیوان غالب (متداول) تاریخی ترتیب سے ۸۰ روپے
پنج آہنگ میں مکاتیب غالب ۱۲۰ روپے
غالب کا ایک مشّاق شاگرد۔ بالمکند بے صبر ۹۰ روپے
غالبیات۔ کچھ مطالعے اور مشاہدے ۱۰۰ روپے
انتخاب رقعات و اشعارِ غالب ۸۰ روپے
دیوانِ غالب کامل (نسخۂ گپتا رضا)
تاریخی ترتیب سے صفحات پونے چھ سو
(تیسرا جدید اور باتصویر ایڈیشن) ۵۰۰ روپے